اِسلام اور ریاست

(اسلام اور ریاست کے حوالے سے جناب جاوید احمد غامدی
کے افکار اور ان پر اہلِ علم کے تبصرے)

برقی تشکیل و ترتیب

سید متین احمد شاہ

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی

اسلام آباد

mateen.iri@gmail.com

پیش گفتار

حالیے عرصے میں محترم جناب جاوید احمد غامدی نے ''اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ'' کے نام سے روزنامہ جنگ میں ایک کالم لکھا جس کے جواب میں محترم مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے ایک کالم ''اسلام اور ریاست'' کے نام سے لکھا اور پھر اس کے بعد اہلِ علم کی طرف سے میڈیا پر ایک سلسلہ چل نکلا، کالم لکھے گئے، سوشل میڈیا پر پوسٹیں تحریر کی گئیں جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور توقع ہے کہ کچھ عرصہ مزید جاری رہے گا۔ اس بحث سے اس مسئلے کے کئی پہلو منقّح ہو کر سامنے آئے ہیں۔ غامدی صاحب اپنے پہلے کالم کے بعض نکات کی تفصیل پر مزید کالم تحریر کر رہے ہیں اور تادمِ تحریر اس پر مزید دو کالم آ چکے ہیں۔ ان پر بھی ابھی ''لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت'' کے مصداق بہت کچھ کہا جائے گا۔

اس بحث کے بعض منتخب کالم ماہ نامہ **میثاق** (مارچ ۲۰۱۵) میں آئے ہیں۔ زیرِ نظر برقی کتاب اس سلسلے کے دیگر کالموں کو بھی یک جا کرتی ہے۔ اس یک جائی کا پہلے ایک خیال تھا جو محترم ڈاکٹر حافظ زبیر صاحب کی خواہش کے بعد ارادے کی شکل اختیار کر گیا۔ کالموں کو یک جا جمع کرنے میں بنیادی تعاون عزیز دوست جناب حسن الیاس صاحب نے کیا جس کی شکل یہ تھی کہ انھوں نے اپنے پاس ان کے جمع شدہ برقی روابط ارسال کر دیے جس سے میں تلاش کی زحمت سے بچ گیا۔ اللہ ان دونوں احباب کو جزاے خیر عطا فرمائے۔

وقت کی ایک اہم علمی، فکری اور سیاسی بحث کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو یک جا کیا جاتا ہے۔ کالموں کی اصل تشکیل اسی فارمیٹ کے مطابق ہے جس میں وہ اخبارات میں آئے ہیں۔ بعض یونی کوڈ کی شکل میں تھے، جنھیں مرتب کر دیا گیا۔ جناب حامد کمال الدین کا مضمون میثاق کے مذکورہ شمارے سے لیا گیا ہے۔

استفادے کی سہولت کے لیے PDF فائل میں بائیں جناب Bookmark کے آپشن میں جانبی عناوین کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ مطلوبہ کالم تک رسائی آسانی سے ہو سکے۔ اس کو نیچے امیج میں ظاہر کیا گیا ہے۔

اللہ تعالی ہم سب کو اپنی رضا عطا فرمائے۔ آمین

سید متین احمد شاہ

اسلام آباد

۵ مارچ ۲۰۱۴ء

جاوید احمد غامدی

اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ

اِس وقت جو صورت حال بعض انتہا پسند تنظیموں نے اپنے اقدامات سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے پوری دنیا میں پیدا کر دی ہے، یہ اُسی فکر کا مولود فساد ہے جو ہمارے مذہبی مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، اور جس کی تبلیغ اسلامی تحریکیں اور مذہبی سیاسی جماعتیں شب و روز کرتی ہیں۔ اس کے مقابل میں اسلام کا صحیح فکر کیا ہے؟ اس کو ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' میں دلائل کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یہ درحقیقت ایک جوابی بیانیہ (counter narrative) ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں مذہب کی بنیاد پر فساد پیدا کر دیا جائے تو سیکولرازم کی تبلیغ نہیں، بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورت حال کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے تو ہماری اس کتاب ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، لیکن اس کا جو حصہ اسلام اور ریاست سے متعلق ہے، اُس کا ایک خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

جاوید احمد غامدی

اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ

اِس وقت جو صورت حال بعض انتہا پسند تنظیموں نے اپنے اقدامات سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے پوری دنیا میں پیدا کر دی ہے، یہ اُسی فکر کا مولود فساد ہے جو ہمارے مذہبی مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، اور جس کی تبلیغ اسلامی تحریکیں اور مذہبی سیاسی جماعتیں شب و روز کرتی ہیں۔ اِس کے مقابل میں اسلام کا صحیح فکر کیا ہے؟ اِس کو ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' میں دلائل کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یہ درحقیقت ایک جوابی بیانیہ (counter narrative) ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں مذہب کی بنیاد پر فساد پیدا کر دیا جائے تو سیکولرازم کی تبلیغ نہیں، بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورت حال کی اصلاح کر سکتا ہے۔ اِس کی تفصیلات کے لیے تو ہماری اِس کتاب ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے، لیکن اِس کا جو حصہ اسلام اور ریاست سے متعلق ہے، اُس کا ایک خلاصہ ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

۱۔ اسلام کی دعوت اصلاً فرد کے لیے ہے۔ وہ اُسی کے دل و دماغ پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے جو احکام معاشرے کو دیے ہیں، اُس کے مخاطب بھی درحقیقت وہ افراد ہیں جو مسلمانوں کے معاشرے میں ارباب حل و عقد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری پوری کر رہے ہوں۔ لہٰذا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اُس کو بھی کسی قرارداد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اِس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اُس میں کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ یہ خیال جن لوگوں نے پیش کیا اور اِسے منوانے میں کامیابی حاصل کی ہے، اُنھوں نے اِس زمانے کی قومی ریاستوں میں مستقل تفرقے کی بنیاد رکھ دی اور

اُن میں بسنے والے غیر مسلموں کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ درحقیقت دوسرے درجے کے شہری ہیں جن کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک محفوظ اقلیت (protected minority) کی ہے اور ریاست کے اصل مالکوں سے وہ اگر کسی حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں تو اِسی حیثیت سے کر سکتے ہیں۔

۲۔ جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ اپنی ایک ریاست ہائے متحدہ قائم کر لیں۔ یہ ہم میں سے ہر شخص کا خواب ہو سکتا ہے اور ہم اِس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی جدوجہد بھی کر سکتے ہیں، لیکن اِس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم ہے جس کی خلاف ورزی سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہرگز نہیں، نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اِس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔ پہلی صدی ہجری کے بعد ہی، جب مسلمانوں کے جلیل القدر فقہا اُن کے درمیان موجود تھے، اُن کی دو سلطنتیں، دولت عباسیہ بغداد اور دولت امویہ اندلس کے نام سے قائم ہو چکی تھیں اور کئی صدیوں تک قائم رہیں، مگر اُن میں سے کسی نے اِسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا، اِس لیے کہ اِس معاملے میں سرے سے کوئی حکم قرآن وحدیث میں موجود ہی نہیں ہے۔ اِس کے برخلاف یہ بات سب نے کہی اور ہم بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا نظم اجتماعی اگر کسی جگہ قائم ہو جائے تو اُس سے خروج ایک بدترین جرم ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اُس کے مرتکبین جاہلیت کی موت مریں گے۔

۳۔ اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے، جس طرح کے عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں کسی جگہ یہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں یا اُنھیں ایک ہی قوم ہونا چاہیے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ 'اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ' (مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔ قرآن کی رو سے مسلمانوں کا باہمی رشتہ قومیت کا نہیں، بلکہ اخوت کا ہے۔ وہ دسیوں اقوام، ممالک اور ریاستوں میں تقسیم ہونے کے باوجود ایمان کے رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اِس لیے یہ تقاضا تو اُن سے کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کے حالات کی خبر رکھیں، اُن کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں اُن کے کام آئیں، وہ مظلوم ہوں تو اُن کی مدد کریں، معاشی اور معاشرتی روابط کے لیے اُن کو ترجیح دیں اور اُن پر اپنے دروازے کسی حال میں بند نہ کریں، مگر یہ تقاضا نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی قومی ریاستوں اور قومی شناخت سے دست بردار ہو کر لازماً ایک ہی قوم اور ایک ہی ریاست بن جائیں۔ وہ جس طرح اپنی الگ الگ قومی ریاستیں قائم کر سکتے ہیں، اُسی طرح دین وشریعت پر عمل کی آزادی ہو تو غیر مسلم ریاستوں میں شہری کی حیثیت سے اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن کر بھی رہ سکتے ہیں۔ اِن میں سے کوئی چیز قرآن وحدیث کی رو سے ناجائز نہیں ہے۔

۴۔ دنیا میں جو لوگ مسلمان ہیں، اپنے مسلمان ہونے کا اقرار، بلکہ اُس پر اصرار کرتے ہیں، مگر کوئی ایسا عقیدہ یا عمل اختیار کر لیتے ہیں جسے کوئی عالم یا علما یا دوسرے تمام مسلمان صحیح نہیں سمجھتے، اُن کے اِس عقیدے یا عمل کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے، اُسے ضلالت اور گمراہی بھی کہا جا سکتا ہے، لیکن اُس کے حاملین چونکہ قرآن و حدیث ہی سے استدلال کر رہے ہوتے ہیں، اِس لیے اُنھیں غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِس طرح کے عقائد و اعمال کے بارے میں خدا کا فیصلہ کیا ہے؟ اِس کے لیے قیامت کا انتظار کرنا چاہیے۔ دنیا میں اِن کے حاملین اپنے اقرار کے مطابق مسلمان ہیں، مسلمان سمجھے جائیں گے اور اُن کے ساتھ تمام معاملات اُسی طرح ہوں گے، جس طرح مسلمانوں کی جماعت کے ایک فرد کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ علما کا حق ہے کہ اُن کی غلطی اُن پر واضح کریں، اُنھیں صحیح بات کے قبول کرنے کی دعوت دیں، اُن کے عقائد و نظریات میں کوئی چیز شرک ہے تو اُسے شرک اور کفر ہے تو اُسے کفر کہیں اور لوگوں کو بھی اُس پر متنبہ کریں، مگر اُن کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے یا اُنھیں مسلمانوں کی جماعت سے الگ کر دینا چاہیے، اِس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے، اِس لیے کہ یہ حق خدا ہی دے سکتا تھا اور قرآن و حدیث سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اُس نے یہ حق کسی کو نہیں دیا ہے۔

۵۔ شرک، کفر اور ارتداد یقیناً سنگین جرائم ہیں، لیکن اِن کی سزا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نہیں دے سکتا۔ یہ خدا کا حق ہے۔ قیامت میں بھی اِن کی سزا وہی دے گا اور دنیا میں بھی، اگر کبھی چاہے تو وہی دیتا ہے۔ قیامت کا معاملہ اِس وقت موضوع بحث نہیں ہے۔ دنیا میں اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں اپنی عدالت کے ظہور کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو اُس کی طرف اپنا رسول بھیجتے ہیں۔ یہ رسول اُس قوم پر اتمام حجت کرتا ہے، یہاں تک کہ کسی کے پاس خدا کے حضور میں پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ اِس کے بعد خدا کا فیصلہ صادر ہوتا ہے اور جو لوگ اِس طرح اتمام حجت کے بعد بھی کفر و شرک پر اصرار کریں، اُنھیں اِسی دنیا میں سزا دی جاتی ہے۔ یہ ایک سنت الٰہی ہے جسے قرآن نے اِس طرح بیان فرمایا ہے کہ ''ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب اُن کا رسول آ جاتا ہے تو اُن کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں کیا جاتا۔'' اِس کی نوعیت بالکل وہی ہے جو اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی اور واقعۂ خضر میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اِس کا عام انسانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم جس طرح کسی غریب کی مدد کے لیے اُس کی اجازت کے بغیر اُس کی کشتی میں شگاف نہیں ڈال سکتے، کسی بچے کو والدین کا نافرمان دیکھ کر اُس کو قتل نہیں کر سکتے، اپنے کسی خواب کی بنیاد پر ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے بیٹے کے گلے پر چھری نہیں رکھ سکتے، اُسی طرح کسی شخص کو اُس کے شرک، کفر یا ارتداد کی سزا بھی نہیں

دے سکتے، الّا یہ کہ وحی آئے اور خدا اپنے کسی رسول کے ذریعے سے براہ راست اِس کا حکم دے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اِس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔

۶۔ اِس میں شبہ نہیں کہ جہاد اسلام کا حکم ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ اُن کے پاس طاقت ہو تو وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ کریں۔ قرآن میں اِس کی ہدایت اصلاً فتنہ کے استیصال کے لیے کی گئی ہے۔ اِس کے معنی کسی شخص کو ظلم و جبر کے ساتھ اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'persecution' کہا جاتا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ حکم اُن کی انفرادی حیثیت میں نہیں، بلکہ بحیثیت جماعت دیا گیا ہے۔ اِس کی جو آیتیں قرآن میں آئی ہیں، وہ اپنی انفرادی حیثیت میں اُن کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا اِس معاملے میں کسی اقدام کا حق بھی اُن کے نظم اجتماعی کو حاصل ہے۔ اُن کے اندر کا کوئی فرد یا گروہ ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اُن کی طرف سے اِس طرح کے کسی اقدام کا فیصلہ کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ مسلمانوں کا حکمران اُن کی سپر ہے، جنگ اُسی کے پیچھے رہ کر کی جاتی ہے۔

۷۔ اسلام جس جہاد کا حکم دیتا ہے، وہ خدا کی راہ میں جنگ ہے، اِس لیے اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے اُن سے انحراف کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی۔ چنانچہ یہ بالکل قطعی ہے کہ جہاد صرف مقاتلین (combatants) سے کیا جاتا ہے۔ اسلام کا قانون یہی ہے کہ اگر کوئی زبان سے حملہ کرے گا تو اُس کا جواب زبان سے دیا جائے گا، لڑنے والوں کی مالی مدد کرے گا تو اُس کو مدد سے روکا جائے گا، لیکن جب تک وہ ہتھیار اٹھا کر لڑنے کے لیے نہیں نکلتا، اُس کی جان نہیں لی جا سکتی۔ یہاں تک کہ عین میدان جنگ میں بھی وہ اگر ہتھیار پھینک دے تو اُسے قیدی بنایا جائے گا، اُس کے بعد اُسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں جہاد کا حکم جس آیت میں دیا گیا ہے، اُس کے الفاظ ہی یہ ہیں کہ ''اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑیں اور اِس میں کوئی زیادتی نہ کرو، اِس لیے کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے دوران میں عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ اِس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اگر جنگ کرنے والوں کے ساتھ نکلے بھی ہوں تو بالعموم مقاتل نہیں ہوتے، زیادہ سے زیادہ لڑنے والوں کا حوصلہ بڑھا سکتے اور زبان سے اُنھیں لڑنے کی ترغیب دے سکتے ہیں۔

۸۔ دور حاضر کے مغربی مفکرین سے صدیوں پہلے قرآن نے اعلان کیا تھا کہ 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'، (مسلمانوں کا نظم اجتماعی اُن کے باہمی مشورے پر مبنی ہوگا)۔ اِس کے صاف معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت

اُن کے مشورے سے قائم ہوگی۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے گا۔ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں گے۔ جو کچھ مشورے سے بنے گا، وہ مشورے سے توڑا بھی جا سکے گا۔ جس چیز کو وجود میں لانے کے لیے مشورہ کیا جائے گا، ہر شخص کی راے اُس کے وجود کا حصہ بنے گی۔ اجماع و اتفاق سے فیصلہ نہ ہو سکے تو فصل نزاعات کے لیے اکثریت کی راے قبول کر لی جائے گی۔

یہی جمہوریت ہے۔ چنانچہ آمریت کسی خاندان کی ہو یا کسی طبقے، گروہ یا قومی ادارے کی، کسی حال میں بھی قبول نہیں کی جا سکتی، یہاں تک کہ نظم اجتماعی سے متعلق دینی احکام کی تعبیر و تشریح کے لیے دینی علوم کے ماہرین کی بھی نہیں۔ وہ یہ حق یقیناً رکھتے ہیں کہ اپنی تشریحات پیش کریں اور اپنی آرا کا اظہار کریں، مگر اُن کے موقف کو لوگوں کے لیے واجب الاطاعت قانون کی حیثیت اُسی وقت حاصل ہوگی، جب عوام کے منتخب نمایندوں کی اکثریت اُسے قبول کر لے گی۔ جدید ریاست میں پارلیمان کا ادارہ اسی مقصد سے قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اُسی کا ہے اور اُسی کا ہونا چاہیے۔ لوگوں کا حق ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں پر تنقید کریں اور اُن کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرتے رہیں، لیکن اُن کی خلاف ورزی اور اُن سے بغاوت کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ علما ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔ 'اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ' کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود وہ عملاً اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اُس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ اِس سے ہٹ کر جو حکومت بھی قائم کی جائے گی، وہ ایک ناجائز حکومت ہوگی، خواہ اُس کے سربراہ کی پیشانی پر سجدوں کے نشان ہوں یا اُسے امیر المومنین کے لقب سے نواز دیا جائے۔

۹۔ مسلمانوں کی حکومت اگر کسی جگہ قائم ہو تو اُس سے بالعموم نفاذ شریعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یہ تعبیر مغالطہ انگیز ہے، اِس لیے کہ اِس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ شریعت کے تمام احکام ریاست کی طاقت سے لوگوں پر نافذ کر دے، دراں حالیکہ قرآن و حدیث میں یہ حق کسی حکومت کے لیے بھی ثابت نہیں ہے۔ اسلامی شریعت میں دو طرح کے احکام ہیں: ایک، جو فرد کو بحیثیت فرد دیے گئے ہیں اور دوسرے، جو مسلمانوں کے معاشرے کو دیے گئے ہیں۔ پہلی قسم کے احکام کا معاملہ خدا اور بندے کے درمیان ہے اور وہ اُس میں کسی حکومت کے سامنے نہیں، بلکہ اپنے پروردگار ہی کے سامنے جواب دہ ہے۔ لہٰذا دنیا کی کوئی حکومت اُسے، مثال کے طور پر، روزہ رکھنے یا حج و عمرہ کے لیے جانے یا ختنہ کرانے یا مونچھیں پست رکھنے اور وہ اگر عورت ہے تو سینہ ڈھانپنے، زیب و زینت کی نمایش نہ کرنے یا اسکارف اوڑھ کر

باہر نکلنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔ اِس طرح کے معاملات میں تعلیم و تربیت اور تلقین و نصیحت سے آگے اُس کے کوئی اختیارات نہیں ہیں، الّا یہ کہ کسی کی حق تلفی یا جان، مال، آبرو کے خلاف زیادتی کا اندیشہ ہو۔ قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ دین کے ایجابی احکام میں سے یہ صرف نماز اور زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی، اگر چاہے تو قانون کی طاقت سے کر سکتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اِس کے بعد وہ پابند ہے کہ اُن کی راہ چھوڑ دے اور کوئی چیز اُن پر نافذ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ رہے دوسری قسم کے احکام تو وہ درحقیقت دیے ہی حکومت کو گئے ہیں، اِس لیے کہ اجتماعی معاملات میں وہی معاشرے کی نمایندگی کرتی ہے۔ علما ارباب حل وعقد سے اُن پر عمل کا مطالبہ کریں تو یقیناً حق بجانب ہوں گے اور اپنے منصب کے لحاظ سے اُن کو کرنا بھی چاہیے۔ مگر یہ شریعت پر عمل کی دعوت ہے، نفاذ شریعت کی تعبیر اِس کے لیے بھی موزوں قرار نہیں دی جا سکتی۔

یہ دوسری قسم کے احکام درج ذیل ہیں:

ا۔ مسلمان اپنے حکمرانوں کی رعایا نہیں، بلکہ برابر کے شہری ہوں گے۔ قانون اور ریاست کی سطح پر اُن کے بڑے اور چھوٹے اور شریف اور وضیع کے مابین کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ اُن کے جان و مال اور آبرو کو حرمت حاصل ہو گی، یہاں تک کہ حکومت اُن کی رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس بھی اُن پر عائد نہیں کر سکے گی۔ اُن کے شخصی معاملات، یعنی نکاح، طلاق، تقسیم وراثت، لین دین اور اِس نوعیت کے دوسرے امور میں اگر کوئی نزاع اُن کے درمیان پیدا ہو جائے گی تو اُس کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہو گا۔ روز و شب کی نمازوں، ماہ رمضان کے روزوں اور حج و عمرہ کے لیے اُنھیں تمام ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ اُن پر عدل و انصاف کے ساتھ اور 'اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ' کے طریقے پر حکومت کی جائے گی۔ اُن کے قومی املاک اجتماعی ضرورتوں کے لیے خاص رہیں گے، اُنھیں نجی ملکیت میں نہیں دیا جائے گا، بلکہ اِس طرح نشوونما دی جائے گی کہ جو لوگ معیشت کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں، اُن کی ضرورتیں بھی اِن املاک کی آمدنی سے پوری ہوتی رہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہوں گے تو اُن کی تجہیز و تکفین مسلمانوں کے طریقے پر ہو گی، اُن کا جنازہ پڑھا جائے گا اور اُنھیں مسلمانوں کے قبرستان میں اور اُن کے طریقے پر دفن کیا جائے گا۔

ب۔ نماز جمعہ اور نماز عیدین کا اہتمام حکومت کرے گی۔ یہ نمازیں صرف اُنھی مقامات پر ادا کی جائیں گی جو حکومت کی طرف سے اُن کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے۔ اِن کا منبر حکمرانوں کے لیے خاص ہو گا۔ وہ خود اِن نمازوں کا خطبہ دیں گے اور اِن کی امامت کریں گے یا اُن کی طرف سے اُن کا کوئی نمایندہ یہ ذمہ داری ادا کرے گا۔ ریاست کے حدود میں کوئی شخص اپنے طور پر اِن نمازوں کا اہتمام نہیں کر سکے گا۔

ج۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اصلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارے ہوں گے۔ چنانچہ معاشرے کے صالح ترین افراد اِن اداروں کے لیے کارکنوں کی حیثیت سے منتخب کیے جائیں گے۔ وہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کریں گے اور اُن سب چیزوں سے روکیں گے جنھیں انسان ہمیشہ سے برائی سمجھتا رہا ہے۔ تاہم قانون کی طاقت اُسی وقت استعمال کریں گے، جب کوئی شخص کسی کی حق تلفی کرے گا یا اُس کی جان، مال یا آبرو کے خلاف کسی اقدام کے درپے ہوگا۔

د۔ حکومت اپنے دشمنوں کے معاملے میں بھی قائم بالقسط رہے گی۔ حق کہے گی، حق کی گواہی دے گی اور حق و انصاف سے ہٹ کر کبھی کوئی اقدام نہیں کرے گی۔

ہ۔ ریاست کے اندر یا باہر اگر کسی سے کوئی معاہدہ ہوا ہے تو جب تک معاہدہ باقی ہے، لفظ اور معنی، دونوں کے اعتبار سے اُس کی پابندی پوری دیانت اور پورے اخلاص کے ساتھ کی جائے گی۔

و۔ قتل اور فساد فی الارض کے سوا موت کی سزا کسی جرم میں بھی نہیں دی جائے گی۔ نیز ریاست کا کوئی مسلمان شہری اگر زنا، چوری، قتل، فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی، خاندانی اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے تو اُس پر وہ سزائیں نافذ کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد اِن جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔

ز۔ اسلام کی دعوت کو اقصاے عالم تک پہنچانے کے لیے حکومت کی سطح پر اہتمام کیا جائے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اگر اِس میں رکاوٹ پیدا کرے گی یا ایمان لانے والوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بنائے گی تو حکومت اپنی استطاعت کے مطابق اِس رکاوٹ کو دور کرنے اور اِس تشدد کو روکنے کی کوشش کرے گی، اگرچہ اِس کے لیے تلوار اٹھانی پڑے۔

۱۰۔ نظم اجتماعی سے متعلق یہ شریعت کے احکام ہیں اور اِس تنبیہ و تہدید کے ساتھ دیے گئے ہیں کہ جو لوگ خدا کی کتاب کو مان کر اُس میں خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، قیامت کے دن وہ اُس کے حضور میں ظالم، فاسق اور کافر قرار پائیں گے۔ تاہم مسلمانوں کے ارباب حل و عقد اگر اِس کے باوجود اِس معاملے میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے یا سرکشی اختیار کر لیتے ہیں تو علما و مصلحین کی ذمہ داری اِس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اُنھیں دنیا اور آخرت میں اِس کے نتائج سے خبردار کریں۔ اُنھیں حکمت کے ساتھ اور موعظۂ حسنہ کے اسلوب میں صحیح رویہ اختیار کرنے کی دعوت دیں، اُن کے سوالات کا سامنا کریں، اُن کے اشکالات دور کریں اور دلائل کے ساتھ اُنھیں

بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کیوں دی ہے؟ اجتماعی زندگی کے ساتھ اُس کا کیا تعلق ہے؟ اُس میں احکام کی بنیاد کیا ہے اور دورِ حاضر کا انسان اُس کو سمجھنے میں دقت کیوں محسوس کرتا ہے؟ اُس کی تفہیم و تبیین کے لیے ایسے اسالیب اختیار کریں جن سے اُس کی حکمت، معنویت اور اُس کے مقاصد اُن پر واضح ہوں اور اُن کے دل و دماغ پورے اطمینان کے ساتھ اُسے قبول کرنے اور اُس پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔ قرآن میں اُن کا منصب دعوت و انذار بتایا گیا ہے۔ وہ اپنی قوم اور اُس کے اربابِ حل و عقد کے لیے داروغہ نہیں بنائے گئے کہ اپنے پیروکاروں کے جتھے منظّم کر کے بندوق کے زور پر اُنھیں شریعت کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔

[۲۰۱۴ء]

اسلام اور ریاست

غیر منقسم ہندوستان میں قائداعظم کی قیادت میں قیام پاکستان کی جو تحریک چلی'اس کی بنیاد مسلم قومیت کے نظریے پر تھی' انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں جو تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم قرار دے کر اکھنڈ بھارت کے حق میں تھے' قائداعظم نے پورے زوروشور اور دلائل کی روشنی میں یہ نعرہ لگایا کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم'مسلمان رہنماؤں'اہل فکر اور علمائے کرام نے اس کی بھرپور تائید کی اور میرے بچپن میں ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الااللہ'' کی جو صدائیں گونجتی تھیں'ان کی دلکش یاد آج بھی کانوں میں محفوظ ہے۔ آخر کار مسلم اکثریت نے قائداعظم کی اس پکار پر لبیک کہا'اور ناقابل فراموش قربانیوں کے بعد ہمالیہ کے دامن میں ارض پاک ایک حقیقت بن کر ابھری'نظریہ پاکستان کی بنیاد تو واضح تھی لیکن ایک چھوٹا سا حلقہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے دستور پاکستان کیلئے وہ قرارداد مقاصد بااتفاق منظور کی جس نے ملک کا رخ واضح طور پر متعین کردیا کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے'اور عوام کے منتخب نمائندے اپنے اختیارات قرآن وسنت کی حدود میں رہ کر استعمال کرسکیں گے'اور یہ قرارداد 1954'1956'1962 اور 1973 کے تمام دستوری مسودوں کا الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ لازمی جز بنی رہی'اور آج بھی وہ ہمارے دستور کی وہ دستاویز ہے جس پر ہم فخر کرسکتے ہیں چوتھائی صدی تک بنتی ٹوٹتی اسمبلیوں میں بھی اور باہر بھی اس پر کھلے دل سے بحث ومباحثہ بھی ہوا'اور بالآخر اس پر پورے ملک کا اتفاق ہو گیا پھر اس کی بنیاد پر دستور کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو یہ دفعہ بھی تمام مسودات دستور میں کسی قابل ذکر اختلاف کے بغیر موجود رہی کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کیخلاف نہیں بنایا جاسکے گا اور موجودہ قوانین کو بھی ان کے سانچے میں ڈھالا جائے گا سن 1973ء کا دستور جو آج بھی نافذ ہے'اس وقت کے تمام سیاسی اور دینی حلقوں کے اتفاق سے منظور ہوا'اور اس پر بفضلہٖ تعالیٰ آج بھی تمام سیاسی پارٹیاں متفق ہیں اور اس کا مکمل تحفظ چاہتی ہیں جس کا مظاہرہ اوراس کی مزید تاکید حال ہی میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے تاریخی اتفاق سے دوبارہ ہو گئی ہے'اعلیٰ عدالتوں نے بھی اس دستور کی بنیادی روح کا لازمی حصہ قرار دیا ہے۔

اب کچھ عرصے سے کچھ آوازیں پھر گونجنے لگی ہیں کہ ملک کو اس دہشت گردی سے پاک کرنے کیلئے اسے سیکولر بنانا چاہئے'یعنی نصف صدی سے زائد جو فکری'سیاسی اور عملی جدوجہد ملک کا صحیح رخ متعین کرنے کیلئے ہوئی ہے'اس کی بساط لپیٹ کر پھر الف با سے آغاز کرنا چاہئے ایک ایسے موقع پر جب ملک کے تمام طبقات دہشت گردی کے عفریت کو مل کر شکست دینے کیلئے کمربستہ ہیں ملک کی بنیاد اس کے قیام کے نظریے اور اس کے متفقہ رخ کو تبدیل کرنے کی کوشش اس فضا میں جو پنڈورا بکس کھول سکتی ہے' اوراس سے جو انتشار جنم لے سکتا ہے'اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

اسی فضا میں سیکولرازم کے حامی حضرات جو کچھ فرمارہے ہیں اس کی بازگشت مذہب کے نام پر ایک مذہبی بیانیہ کے عنوان سے سامنے آئی ہے جو روزنامہ جنگ کے 22 جنوری کے شمارے میں ''اسلام اور ریاست'ایک جوابی بیانیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے ''سیکولرازم کی تبلیغ'' کے بجائے اپنے افکار کو ''مذہبی بیانیہ'' قرار دیا ہے اس ''بیانیہ'' کا مقصد انہوں نے شروع ہی میں یہ بیان فرمایا ہے کہ سیکولرازم کی تبلیغ نہیں' بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورتحال کی اصلاح کرسکتا ہے ''اس جوابی بیانیے (Counter narrative) کے جو نکات انہوں نے بیان فرمائے ہیں'ان کو بار بار پڑھنے کے باوجود مجھے شاید اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہ ایک عجوبے سے کم نہیں لگتے اور ان کے باہمی تضادات سے مجھے بہت سے تاویلات کے باوجود چھٹکارا نہیں مل سکا اس مضمون میں یوں تو بہت سی باتیں قابل تبصرہ ہیں لیکن ان تمام نکات پر تبصرہ بہت طول چاہتا ہے جس کا یہ مضمون متحمل نہیں لیکن ان میں سے چند متضاد نکات اور ان کے مضمرات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ نکات نہ صرف پاکستان کے قیام کے نظریے ہی کی نفی کرتے ہیں' بلکہ ملک کو ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے نظام اجتماعی کی طرف دعوت دیتے ہیں جن کے عملی اطلاق کی کوئی معقول صورت کم از کم مجھ کم فہم کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

سب سے پہلے نکتے میں انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے'اور اس کو بھی کسی قرارداد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کیخلاف نہیں بنایا جائے گا'' اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے آئین میں جو قرارداد مقاصد درج ہے'یا اس میں جو پابندی عائد کی گئی ہے کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا' یہ قطعی طور پر نہ صرف غیر ضروری' بلکہ بے بنیاد خیال پر مبنی ہے قرارداد مقاصد کا بنیادی تصور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اقرار ہے' اور اسے غیر ضروری اور بے بنیاد قرار دینے کا نتیجہ ریاست کیلئے اس حاکمیت اعلیٰ کے اقرار کو بے بنیاد قرار دینے کے سوا اور کیا ہے؟

یہ بیانیہ وہ ''سیکولرازم کی تبلیغ'' کے مقابلے میں یا اس کے متبادل کے طور پر پیش کررہے ہیں' لیکن اول تو یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ''سیکولرازم کی تبلیغ'' اور ''مذہبی بیانیہ'' کے اس نکتے میں کیا فرق ہوا؟ سیکولرازم بھی یہی کہتا ہے کہ ''ریاست کا دین سے کوئی تعلق نہیں' کیونکہ دین ایک خالص انفرادی معاملہ ہے'وہ بھی یہی کہتا ہے کہ پارلیمان پر کسی دین کی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی' لہذا قرارداد مقاصد کی کوئی ضرورت نہیں اور یہی باتیں مضمون اس نکتے میں بھی ارشاد فرمائی گئی ہیں کیا عنوان بدل دینے سے حقیقت میں کوئی فرق آجاتا ہے؟

پھر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد آگے خود وہ نکتہ نمبر 8 میں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ارشاد امرھم شوریٰ بینھم کا تقاضا ہے کہ ملک میں ایک پارلیمان قائم ہونی چاہئے'اور ''علماؤں یا ریاست کی عدلیہ' پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہوسکتا۔ امرھم شوریٰ بینھم کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سرتسلیم خم کردیں اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے اس سے ہٹ کر جو حکومت قائم کی جائے گی'وہ ایک ناجائز حکومت ہو گی''۔

ان دونوں باتوں کے مجموعے سے مطلب یہی نکلتا ہے کہ پارلیمان وجود میں تو قرآنی حکم امرھم شوریٰ بینھم کے تحت آئیگی مگر اس کے بعد اسے اس بات کا پابند نہیں کیا جاسکتا کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہ بنائے'البتہ ملک کے افراد اور ادارے اس بات کے پابند ہیں کہ وہ پارلیمان کے ہر فیصلے پر سرتسلیم خم کردیں۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ریاست کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے'اور نہ پارلیمان کے فیصلوں کو قرآن وسنت کا پابند کیا جاسکتا ہے' تو ''امرھم شوریٰ بینھم'' کا قرآنی اصول اس کیلئے کس بنیاد پر لازم ہو گیا؟ اور یہ بات کس بنیاد پر کہی جارہی ہے کہ ''اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے'' جبکہ ریاست کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر پارلیمان مغربی ممالک کی طرح ہم جنس شادیوں کا قانون نافذ کردے'تو کیا قرآن کریم کا باہمی مشاورت کا یہ اصول پھر بھی ''ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سرتسلیم خم کردیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جبکہ پارلیمان پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ قرآن وسنت کیخلاف قانون سازی نہ کرے؟

پھر انہوں نے آگے اپنے نکتہ نمبر 9 میں فرمایا کہ ''دین کے ایجابی احکام میں سے یہ صرف نماز اور زکوۃ ہے جس کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی اگر چاہے تو قانون کی طاقت سے کرسکتا ہے ''نظم اجتماعی'' سے ان کی مراد غالباً حکومت ہی ہے' تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نماز کو بزور قانون لازمی قرار دے کر بے نمازیوں پر سزا جاری کرے؟ اگر یہ واقعی کوئی قرآن کریم کا حکم ہے کہ نماز کا مطالبہ قانون کی طاقت سے کیا جائے' جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے'تو پھر ''اگر چاہے' کی جو شرط انہوں نے لگائی ہے'اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اس قرآنی حکم پر عمل حکومت کی چاہت پر موقوف ہے'لہذا اگر وہ نہ چاہے تو اس حکم پر عمل نہ کرے۔ اس صورت میں سورۃ احزاب کی اس آیت (نمبر 36) کا کیا مطلب ہو گا جس میں فرمایا گیا ہے ''اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کردیں تو کسی مومن مرد یا عورت کیلئے یہ گنجائش نہیں ہے کہ انہیں اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے''۔

آگے معاشرتی احکام کے حوالے سے اپنے نکتہ نمبر 1 میں وہ فرماتے ہیں ''حکومت ان کی (عوام کی) رضامندی کے بغیر زکوۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس ان پر عائد نہیں کرسکے گی، ان کے شخصی معاملات، یعنی نکاح، طلاق، تقسیم وراثت، لین دین اور اس نوعیت کے دوسرے امور اگر ان میں کوئی نزاع ہو تو اس کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہو گا۔'' یہاں پھر کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب ریاست کا کوئی مذہب نہیں اور اس پر قرآن وسنت یا شریعت کے مطابق قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں، تو عدلیہ پر ان احکام میں شریعت ہی کے مطابق فیصلے کرنے کی پابندی کس بنیاد پر ہو گی؟ اور اگر ان معاملات میں پالیمان شریعت کے بجائے کسی اور قانون کی پابندی کا حکم دے تو اس کے سامنے نکتہ نمبر 8 کے تحت سرتسلیم کیوں خم نہ کیا جائے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''ان کی رضامندی کے بغیر زکوۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس عائد نہیں کرے گی'' ظاہر ہے کہ اس میں عوام کی رضامندی سے مراد پارلیمان کی مرضی ہے، لہٰذا مذکورہ جملے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کوئی اور ٹیکس عائد کرنے کے لئے تو پارلیمان کی منظوری درکار ہے، لیکن زکوۃ حکومتی سطح پر عائد کرنے کے لئے پارلیمان کی منظوری کی ضرورت نہیں ہے، اگر یہی مقصود ہے، تو حکومت پارلیمان کے کسی قانون کے بغیر زکوۃ کس بنیاد پر وصول کرے گی اور اس کی اس اتھارٹی کا سرچشمہ کیا ہو گا۔ اگر وہ سرچشمہ قرآن کریم ہے تو کہنا ہو گا کہ قرآن کریم پارلیمان پر بالادستی رکھتا ہے۔ پھر ریاست کا کوئی مذہب نہ ہونے کا اصول کہاں گیا؟ آگے انہوں نے فرمایا ہے ''ریاست کا کوئی مسلمان شہری اگر زنا، چوری، قتل، فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی، خاندانی، اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں، تو اس پر وہ سزائیں نافذ کی جائے گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قبول کرلینے کے بعد ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کیلئے اپنی کتاب میں مقرر کردی ہیں۔ یہاں دو سوال پھر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ایسی صورت میں پارلیمان اور حکومت پر لازم ہے کہ وہ ایسے مسلمانوں پر یہ قرآنی سزائیں جاری کرے؟ اگر قرآن کریم کے حکم کے تحت لازم ہے تو جب پارلیمان پر قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں ہے، تو اس پر یہ پابندی کیسے لازم ہو گی کہ وہ قرآنی سزائیں ہی جاری کرے اور ان معاملات میں اپنی طرف سے کوئی اور سزا تجویز نہ کرے، یا ان میں سے کسی جرم (مثلاً زنا بالرضا) کو جائز قرار نہ دے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ سزائیں قرآن کریم ہی کی بنیاد پر دی جائے گی تو کیا قرآن کریم میں کوئی ایسی تفریق ہے کہ یہ سزائیں صرف ان مسلمانوں کے لئے ہیں جو شعور کے ساتھ اسلام کی دعوت کو قبول کریں، اور غیر مسلم چوروں، قاتلوں اور فسادفی الارض پھیلانے والوں کو ان سے مستثنٰی رکھا جائے، جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ سزائیں صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہوں گی؟ انہوں نے اپنے اس ''بیانیے'' میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ''اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے قرآن وحدیث میں کسی جگہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں، یا انہیں ایک ہی قوم ہونا چاہئے۔'' یہ وہی دو قومی نظریہ کا مسئلہ ہے جس کی بنیاد پر قائداعظم نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ یہاں مودبانہ گزارش یہ ہے کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں پر لغت یا عرف عام کے مطابق لفظ ''قوم'' کا اطلاق درست ہے یا نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ مستقل سیاسی اور اجتماعی وحدت کے لحاظ سے تمام مسلمانوں کو (چاہے وہ کسی رنگ ونسل سے تعلق رکھتے ہوں) غیر مسلموں سے الگ سمجھنا اور اس بنیاد پر ان کے لئے الگ خطہ زمین کا مطالبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ قائداعظم نے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہوئے جو دو قومی نظریہ پیش کیا تھا اور جس کی بنیاد پر آج ہم ایک الگ ملک کی حیثیت سے بیٹھے ہیں، اس کا مطلب یہی تھا، اس دو قومی نظریہ پر بھی یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے لئے ''قوم'' کا لفظ استعمال کرنا لغت اور عرف عام کے اعتبار سے درست نہیں ہے، لیکن ان کا مقصد ''مستقل سیاسی وحدت'' تھا جس کی بنیاد پر اپنے اختیار سے کوئی حکومت قائم کی جائے۔ لغوی اعتبار سے تو تمام انبیاء علیہم السلام کی مخاطب ان کی قومیں ہی تھیں، لیکن انہوں نے ان کی بنیاد پر کوئی مستقل سیاسی وحدت قائم نہیں کی، اور اگر کوئی ریاست قائم ہوئی تو وہ وطن اور رنگ ونسل کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلام کی بنیاد پر ہوئی، جیسے حضرت موسیٰ، حضرت داؤدو سلیمان علیہم السلام کی حکومتیں اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی حکومت، البتہ اس میں غیر مسلموں کو تمام شہری اور مذہبی حقوق برابر حاصل تھے۔

انہوں نے ایک اور بات اپنے نکتہ نمبر 2 میں یہ ارشاد فرمائی ہے کہ ''نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے، اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔'' قرآن کریم نے سورۂ بقرہ آیت نمبر 30 میں حضرت آدم علیہ اسلام کے تذکرے میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اور سورۂ ص آیت نمبر 26 میں حضرت داؤد علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ''ہم نے تمھیں زمین خلیفہ بنایا ہے۔'' نیز سورۂ نور آیت نمبر 55 میں ارشاد فرمایا ہے: ''تمھیں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں خلافت عطا فرمائے گا، جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو خلافت عطا فرمائی تھی، اور ان کے لئے اس دین کو ضرور اقتدار بخشے گا۔ جسے ان کے لئے پسند کیا ہے، اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے، اس کے بدلے انہیں ضرور امن عطا فرمائے گا، وہ میری عبادت کریں، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔'' اس کے علاوہ متعدد احادیث ہیں جن میں اسلامی ریاست کے امیر کو خلیفہ کہا گیا ہے۔ اور اس کی حکومت کو خلافت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ قرآن وحدیث کے ان ارشادات کی بنا پر اسلامی لٹریچر اس اصطلاح سے بھرا ہوا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے عبقری عالم ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ ''خلافت'' کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''لوگوں کو شرعی طرز فکر کے مطابق چلانا جس سے ان کی آخرت کی مصلحتیں بھی پوری ہوں اور وہ دنیوی مصلحتیں بھی جن کا نتیجہ آخر کار آخرت ہی کی بہتری ہوتا ہے۔'' (مقدمہ ابن خلدون: باب 3 فصل 25 ص 189)

قرآن وحدیث کے ان ارشادات اور چودہ سو سال سے اس اصطلاح کے معروف و مشہور بلکہ متواتر ہونے کے باوجود یہ فرمانا کہ خلافت کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے، اس پر تبصرے کیلئے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ ''مذہبی بیانیہ'' دہشت گردی کے موجودہ مسائل کی اصلاح کرسکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دستور پاکستان کو تلپٹ کرکے ان متضاد نکات کی بنیاد پر نئے سرے سے دستور بنایا جائے تو دہشت گرد اپنی دہشت گردی سے باز آجائیں گے یا ان کا خود بخود قلع قمع ہو جائے گا۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ الحمدللہ ہمارے موجودہ دستور میں چند جزوی باتوں کے سوا کوئی خرابی نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے جوہری احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہورہا ہے ہمارے دستور میں جو بنیادی حقوق دیئے گئے ہیں وہ لوگوں کو پوری طرح حاصل نہیں ہیں، پالیسی کے جو اصول بنائے گئے ہیں ان پر ایک دن عمل نہیں ہوا صوبوں کو جو حقوق ملنے چاہئیں، وہ نہیں مل رہے عوام کو قدم قدم پر مشکلات، رشوت ستانی اور ظلم وستم کے سامنا ہے، معیشت کے میدان میں اونچ نیچ حد سے بڑھی ہوئی ہے سرکاری دفتروں سے کام کرانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، عدل وانصاف کے دروازے غریبوں کے لئے تقریباً بند ہیں دستور میں یہ لکھا ضرور ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور اس کے لئے دستور نے ایک میکنزم بھی تجویز کردیا ہے جس پر اگر ٹھیک ٹھیک عمل ہو تو وہ فرقہ واریت کا بھی سدباب کرسکتا ہے لیکن اسے بر سر کار لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہورہی یہ مجموعی صورتحال عوام میں مایوسی اور چڑ چڑاہٹ پیدا کرتی ہے اور شرپسند لوگوں کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ یہ اصلاحات پرامن ذرائع سے نہیں ہوسکتیں اور حکومتوں کے اس طرز عمل نے اس بات کو مزید ہوا دی ہے کہ جو مطالبہ شریفانہ طور سے وعظ ونصیحت اور مشورے کے طور پر کیا جائے حکومت اسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتی اور لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کوئی مطالبہ اسی وقت قابل سماعت ہوسکتا جب وہ ہڑتال اور جلاؤ گھیراؤ کے ساتھ کیا جائے اور اسی کا آخر حل یہ ہے کہ حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھالئے جائیں ملک کے دشمن مسلسل اس فکر کو ہوا دے رہے ہیں، اور اسی بنیاد پر جذباتی نوجوانوں کو گمراہ کیا جارہا ہے لہٰذا مسئلہ دستور میں کسی جوہری تبدیلی کا نہیں، مسئلہ اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کا ہے، اگر اس پر سنجیدگی سے عمل ہونے لگے، عوام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق انصاف میسر ہو اور اسلام کے عادلانہ قوانین ان کی روح کے ساتھ نافذ کئے جائیں، مجرموں کو انصاف کے تمام تقاضوں کے ساتھ عبرت ناک سزائیں دی جائیں تو یہ مسلح تحریکیں اپنی موت آپ مرجائیں گی۔ خدا کیلئے نیا انتشار پھیلانے کے بجائے متحد ہو کر اس جہت میں کام کریں۔

ریاست اور حکومت

جاوید احمد غامدی
☆☆☆
SMS: #NRC (space) message & send to 8001

ریاست اور حکومت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ علم سیاست کی اصطلاح میں ریاست معاشرے کی سیاسی تنظیم ہے اور حکومت کا لفظ اُن ارباب حل و عقد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو اُس میں نظم و نسق قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوں۔ پہلے ریاست کو لیجیے۔ اِس کی جو اقسام اب تک دنیا میں نمایاں ہوئی ہیں، وہ اصلاً تین ہی ہیں:

ایک، جزیرہ نمائے عرب کی ریاست جس کی حدود خود خالق کائنات نے متعین کر کے اُس کو اپنے لیے خاص کر لیا ہے۔ چنانچہ اُسی کے حکم پر اُس کی دعوت اور عبادت کا عالمی مرکز اُس میں قائم کیا گیا اور ساتویں صدی عیسوی میں آخری رسول کی وساطت سے اعلان کر دیا گیا کہ 'لا یجتمع فیھا دینان' ''اب قیامت تک کوئی غیر مسلم اِس کا شہری نہیں بن سکتا۔'' اِس سے پہلے کئی صدیوں تک یہی حیثیت ریاست فلسطین کی تھی۔ اسلام اور اسلامی شریعت کے مخاطب یہاں بھی اپنی مختلف حیثیتوں میں افراد ہی ہوں گے، تاہم اِس طرح کی ریاست کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اِس کا مذہب اسلام ہے اور اِس میں حکومت بھی اسلام ہی کی ہو گی تو یہ تعبیر ہر لحاظ سے قابل فہم ہے۔ اِس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری، وہ ریاستیں جن کی حدود فاتحین اپنی فتوحات سے متعین کرتے اور اُن کے باشندوں کو محکوم بنا کر اُن پر حکومت کرتے ہیں۔ اِس طرح کی ریاستوں میں شاہی خاندان یا حکمران گروہ کا مذہب اور نظریہ ہی ریاست کا مذہب یا نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ اِس سے قطع نظر کہ اِن کا وجود جائز ہے یا ناجائز، اِن کے متعلق بھی اگر یہ کہا جائے کہ یہ مسلمان یا مسیحی یا کمیونسٹ ریاستیں ہیں تو اِسے ناقابل فہم قرار نہیں دے سکتے۔

تیسری، دور حاضر کی قومی ریاستیں جن کی حدود بین الاقوامی معاہدات سے متعین ہوتی اور جو وجود میں آتے ہی اپنے باشندوں کے لیے بنائے قومیت بن جاتی ہیں۔ لہٰذا رنگ، نسل، زبان، مذہب اور تہذیب و ثقافت کے اشتراک و اختلاف سے قطع نظر وہ اپنے آپ کو ہندی، مصری، امریکی، افغانی اور پاکستانی کہتے اور اپنی قومیت کا اظہار اِسی حوالے سے کرتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی کسی کا حاکم یا محکوم نہیں ہوتا، بلکہ سب ہر لحاظ سے برابر کے شہری سمجھے جاتے ہیں اور اِسی حیثیت سے کاروبار حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔

دور حاضر کی یہی ریاستیں ہیں جن کے بارے میں میں نے لکھا ہے کہ اِن کا کوئی مذہب نہیں ہو سکتا۔ ریاست پاکستان اِسی نوعیت کی ایک ریاست ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اِس کے لیے نہ کوئی فرمان آسمان سے نازل ہوا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کی طرح یہ صرف مسلمانوں کا ملک ہے، نہ مسلمانوں نے اِس کو فتح کر کے اِس میں رہنے والے غیر مسلموں کو اپنا محکوم بنا لیا ہے اور نہ وہ اُن کے ساتھ کسی معاہدے کے نتیجے میں اِس ریاست کے شہری بنے ہیں۔ وہ صدیوں سے اِسی سرزمین کے باشندے ہیں، جس طرح مسلمان اِس کے باشندے ہیں اور ریاست جس طرح مسلمانوں کی ہے، اُسی طرح اُن کی بھی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم اِس اصول پر نہیں ہوئی تھی کہ ایک حصے کے مالک مسلمان اور دوسرے کے ہندو ہیں اور دوسرے مذاہب کے لوگ اُن کے محکوم بنا دیے گئے ہیں، بلکہ اِس اصول پر ہوئی تھی کہ برطانوی ہند کے جن حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُنھیں الگ ملک بنا دیا جائے گا اور ہندوستان کی ریاستوں کے حکمران آزاد ہوں گے کہ چاہیں تو اپنی آزادی برقرار رکھیں اور چاہیں تو ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی کے ساتھ الحاق کر لیں، اِس سے قطع نظر کہ اُن کی رعایا میں اکثریت مسلمانوں کی ہے یا ہندوؤں کی یا کسی دوسرے مذہبی فرقے کی۔ اِس طرح کی ریاست کو اگر اکثریت کے زور پر مسلمان یا مسیحی یا ہندو بنانے کی کوشش کی جائے گی تو یہ محض تحکم اور استبداد ہو گا، جس کی تائید کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس کو اُس کے پروردگار نے حکم دیا ہو کہ وہ ہر حال میں قائم بالقسط رہے گا اور حق کی گواہی دے گا، اگرچہ یہ گواہی اُس کے اپنوں کے خلاف ہی پڑ رہی ہو۔ ریاست پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کے حق میں یہ گواہی اب ضروری ہے کہ تاریخ کے صفحات پر ثبت کر دی جائے۔ یہ اُسی حقیقت کی گواہی ہے جو اِس ریاست کے بانی قائداعظم محمد علی جناح نے 11 اگست 1947 کو مجلس دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے پوری صراحت کے ساتھ واضح فرمائی تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا:

''اب آپ آزاد ہیں۔ اِس مملکت پاکستان میں آپ آزاد ہیں، آپ مندروں میں جائیں، اپنی مساجد میں جائیں یا کسی اور عبادت گاہ میں۔ آپ کا کسی مذہب، ذات پات یا عقیدے سے تعلق ہو، کاروبار ریاست کا اِس سے کوئی واسطہ نہیں ـــ۔ ہم اِس بنیادی اصول کے ساتھ ابتدا کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک مملکت کے یکساں شہری ہیں۔ انگلستان کے باشندوں کو وقت کے ساتھ ساتھ آنے والے حقائق کا احساس کرنا پڑا اور اُن ذمہ داریوں اور اُس بار گراں سے سبک دوش ہونا پڑا جو اُن کی حکومت نے اُن پر ڈال دیا تھا اور وہ آگ کے اُس مرحلے سے بتدریج گزر گئے۔ آپ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب وہاں رومن کیتھولک ہیں نہ پروٹسٹنٹ۔ اب جو چیز موجود ہے، وہ یہ کہ ہر فرد ایک شہری ہے اور سب برطانیہ عظمیٰ کے یکساں شہری ہیں۔ سب کے سب ایک ہی مملکت کے شہری ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اِس بات کو ایک نصب العین کے طور پر اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو ہندو رہے گا، نہ مسلمان مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں، کیوں کہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے اور ایک مملکت کے شہری کی حیثیت سے۔''

(قائداعظم: تقاریر و بیانات 3594)

اِس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اسلام اِس طرح کی ریاست کو قبول کرتا ہے؟ اِس کے جواب میں میں نے یہ عرض کرنے کی جسارت کی ہے کہ اسلام کی دعوت معاشرے کے ارباب حل و عقد کے لیے ہے اور وہ اگر مسلمان ہوں تو نظم اجتماعی سے متعلق اُس کے احکام کے مخاطب بھی وہی ہیں۔ وہ ریاست کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے ہر گز کوئی حکم نہیں دیتا۔ چنانچہ اُس کے ماننے والے اِس طرح کی قومی ریاستوں میں بھی شہری کی حیثیت سے اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن کر رہ سکتے ہیں، جس طرح کہ اِس وقت دنیا کی بیش تر ریاستوں میں رہ رہے ہیں۔ اِس میں کوئی چیز اسلام اور اسلامی شریعت سے متصادم نہیں ہے۔

دور حاضر کی قومی ریاستوں کے بارے میں یہ میرا موقف ہے۔ اِس کے بعد اب حکومت کو لیجیے۔ علم و عقل کی رو سے اِس کے متعلق دو ہی باتیں کہی جا سکتی ہیں: ایک یہ کہ ریاست کے لیے حکمران اور ارباب حل و عقد کا تقرر انسان کا خالق کرے گا۔ دوسرے یہ کہ ریاست کے باشندے کریں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کے بعد پہلی بات کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اب دوسری ہی باقی ہے جس کا لازمی نتیجہ اکثریت کی حکومت ہے۔ یہ اکثریت اگر مسلمانوں کی ہے اور اِس کی بنیاد پر اُنھیں کسی ریاست میں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو اُن کا جمہوری اور انسانی حق ہے کہ اُن کے دین نے اگر کوئی حکم اجتماعی زندگی سے متعلق دیا ہے تو وہ خود بھی اُس پر عمل پیرا ہوں اور اُس کے ماننے والوں کے تمام معاملات کا فیصلہ بھی اُسی شریعت کے مطابق کریں جو اُن کے پروردگار نے اپنے آخری پیغمبر کی وساطت سے نازل فرمائی ہے۔ قائداعظم جب پاکستان کے حوالے سے اسلام، اسلامی تہذیب اور اسلامی شریعت کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کی مراد بھی یہی ہوتی ہے۔

دور حاضر کی قومی ریاستوں کے ساتھ شریعت کا تعلق اِس مقام پر پہنچ کر اور اِس طریقے سے قائم ہوتا ہے۔ میں نے یہی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اِسی کے پیش نظر اجتماعی زندگی سے متعلق اِس شریعت کے احکام کی ایک جامع فہرست بھی مرتب کر کے پیش کر دی ہے اور لکھا ہے کہ مسلمانوں کو یہ احکام اِس تنبیہ و تہدید کے ساتھ دیے گئے ہیں کہ جو لوگ خدا کی کتاب کو مان کر اُس میں خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، قیامت کے دن وہ اُس کے حضور میں ظالم، فاسق اور کافر قرار پائیں گے۔ اہل علم میری مرتب کردہ اِس فہرست سے دلائل کے ساتھ اختلاف کر سکتے اور اِس میں ترمیم و اضافہ بھی کر سکتے ہیں، لیکن ریاست اور حکومت کے اِس فرق کو سمجھنے اور اِس فہرست کو دیکھنے کے بعد بھی اگر وہ کہتے ہیں کہ میں نے شریعت کو فرد کی انفرادی زندگی تک محدود کر دیا ہے یا سیاست، معیشت، معاشرت اور نظم اجتماعی سے متعلق اُس کے احکام کی نفی کر دی ہے اور اُن کا یہ تجاہل عارفانہ نہیں ہے تو اُن کی خدمت میں پھر اِس کے سوا کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا ایں جاست

خلافت

جاوید احمد غامدی

☆☆☆

SMS: #NRC (space) message & send to 8001

اِس میں شبہ نہیں کہ خلافت کا لفظ اب کئی صدیوں سے اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے، لیکن یہ ہرگز کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے۔ دینی اصطلاحات رازی، غزالی، ماوردی، ابن حزم اور ابن خلدون کے بنانے سے نہیں بنتیں اور نہ ہر وہ لفظ جسے مسلمان کسی خاص مفہوم میں استعمال کرنا شروع کر دیں، دینی اصطلاح بن جاتا ہے۔ یہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے بنانے سے بنتی ہیں اور اُسی وقت قابل تسلیم ہوتی ہیں، جب اِن کا اصطلاحی مفہوم قرآن و حدیث کے نصوص یا دوسرے الہامی صحائف سے ثابت کر دیا جائے۔ صوم، صلوٰۃ اور حج و عمرہ وغیرہ اِسی لئے دینی اصطلاحات ہیں کہ اُنھیں اللہ اور اُس کے رسولوں نے یہ حیثیت دی ہے اور جگہ جگہ اُن کے اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ لفظ 'خلافت' اِس کے برخلاف عربی زبان کا ایک لفظ ہے اور نیابت، جانشینی اور حکومت و اقتدار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ اِس کے لغوی مفاہیم ہیں اور قرآن و حدیث میں ہر جگہ یہ اپنے اِن لغوی مفاہیم ہی میں سے کسی ایک مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن کی جو آیات 'خلیفہ' اور 'خلافت' کے الفاظ کو اُن کے ترجمے میں بعینہٖ قائم رکھ کر لوگوں کو یہ باور کرانے کے لئے پیش کی گئی ہیں کہ قرآن نے یہ لفظ کسی خاص اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا ہے، اُنھیں کسی مستند ترجمے یا تفسیر میں دیکھ لیجیے، حقیقت اِس طرح واضح ہو جائے گی کہ آپ کے پاس بھی تبصرے کے لئے کوئی الفاظ باقی نہیں رہیں گے، جس طرح کہ میرے ناقدین میں سے ایک صاحب علم کے پاس نہیں رہے ہیں۔ میں یہاں دو جلیل القدر علما کے تراجم پیش کیے دیتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے:

1۔ سورۂ بقرہ (2) کی آیت 30۔

''اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو، مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب۔'' (شاہ عبدالقادر)

''اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب۔'' (مولانا محمود الحسن)

2۔ سورۂ ص (38) کی آیت 26۔

''اے داؤد، ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں، سو تو حکومت کر لوگوں میں انصاف سے۔'' (شاہ عبدالقادر)

''اے داؤد، ہم نے کیا تجھ کو نائب ملک میں، سو تو حکومت کر لوگوں میں انصاف سے۔'' (مولانا محمود الحسن)

3۔ سورۂ نور (24) کی آیت 55۔

''وعدہ دیا اللہ نے جو لوگ تم میں ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں اُنھوں نے نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کرے گا اُن کو ملک میں، جیسا حاکم کیا تھا اُن سے اگلوں کو۔'' (شاہ عبدالقادر)

''وعدہ کر لیا اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں اُنھوں نے نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کرے گا اُن کو ملک میں، جیسا حاکم کیا تھا اُن سے اگلوں کو۔'' (مولانا محمود الحسن)

'نائب' اور 'حاکم' کے الفاظ اِن آیتوں میں 'خَلِیْفَۃ' اور 'اِسْتِخْلَاف' کا ترجمہ ہیں اور صاف واضح ہے کہ اپنے اندر کوئی دینی مفہوم نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کا حوصلہ کر لے کہ عربی زبان کا ہر وہ لفظ جو قرآن میں استعمال کیا گیا ہو، دینی اصطلاح بن جاتا ہے۔

یہی صورت حال احادیث و آثار کی ہے۔ اُن میں بھی لفظ 'خلافت' اور اِس کے تمام مشتقات اُنھی مفاہیم میں استعمال کیے گئے ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں، یہاں تک کہ جانشین کے معنی میں لفظ 'خَلِیْفَۃ' خود اللہ تعالیٰ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ 'ہدایت یافتہ حکومت' یا 'نبوت کے طریقے پر حکومت'، جیسے مدعا کو ادا کرنا مقصود ہو تو اُس کے لئے یہ لفظ تنہا کافی نہیں ہوتا، بلکہ اِس کے ساتھ 'راشدہ' اور 'علیٰ منہاج النبوۃ' جیسی تعبیرات کا اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے علما نے اِسی طرح کی تعبیرات کو مقدر مان کر خلافت کو ایک اصطلاح بنایا ہے۔ اِس لحاظ سے یہ مسلمانوں کے علم سیاست اور عمرانیات کی ایک اصطلاح تو یقیناً ہو سکتی ہے، جیسے فقہ، کلام، حدیث اور اِس طرح کے دوسرے علوم کی اصطلاحات ہیں، مگر دینی اصطلاح نہیں ہو سکتی۔ اللہ اور رسول کے سوا کسی کی ہستی نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کو دینی اصطلاح قرار دے۔ یہ اُنھی کا حق ہے اور کسی لفظ کے بارے میں یہ دعویٰ کہ وہ دینی اصطلاح ہے، اُنھی کے ارشادات سے ثابت کیا جائے گا۔ یہ ابن خلدون کے مقدمے سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

رہی یہ بات کہ دنیا میں مسلمانوں کی ایک ہی حکومت ہونی چاہیے اور یہ اسلام کا حکم ہے تو قرآن سے واقف ہر صاحب علم جانتا ہے کہ وہ اِس طرح کے کسی حکم سے یکسر خالی ہے۔ دو حدیثیں، البتہ اِس کے حق میں پیش کی جاتی ہیں: اُن میں سے ایک یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل پر نبی حکومت کرتے تھے۔ چنانچہ ایک نبی دنیا سے رخصت ہوتا تو دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، حکمران، البتہ ہوں گے اور بہت ہوں گے۔ پوچھا گیا: اُن کے بارے میں آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: پہلے کے ساتھ عہد اطاعت کو پورا کرو، پھر اُس کے ساتھ جو اُس کے بعد پہلا ہو۔ دوسری یہ ہے کہ جب دو حکمرانوں کی بیعت کر لی جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔ اِس دوسری حدیث پر تو اگرچہ سند کے لحاظ سے بھی بہت کچھ کلام کیا گیا ہے، لیکن بر سبیل تنزل مان لیجیے، تب بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اِن حدیثوں میں وہ بات ہرگز نہیں کہی گئی جو اِن سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اِن میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان اگر اپنی حکومت کے لئے کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیں اور اِس کے بعد کوئی دوسرا بغاوت کر کے اٹھ کھڑا ہو اور لوگوں کو بیعت کی دعوت دے تو ہر مسلمان کو پہلی بیعت پر قائم رہنا چاہیے۔ نیز یہ کہ اگر دوسرا اپنی حکومت کا اعلان کر دے اور کچھ لوگ اُس کی بیعت بھی کر لیں تو اُس کو قتل کر دیا جائے۔

یہ، ظاہر ہے کہ ایسی ہدایات ہیں جن کی معقولیت ہر شخص پر واضح کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد جب انصار میں سے ایک شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ انصار اور مہاجرین، دونوں میں سے ایک ایک حکمران بنا لیا جائے تو سیدنا عمرؓ نے اِسی اصول پر فرمایا کہ یہ تو ایک نیام میں دو تلواریں ہو جائیں گی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی اِس موقع پر لوگوں کو متنبہ کیا کہ ایک ہی مملکت میں دو حکمران نہیں ہو سکتے۔ اِس لئے کہ اِس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ سخت اختلافات پیدا ہو جائیں گے، صلاح کے بجائے فساد بڑھے گا، پورا نظم منتشر ہو کر رہ جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جس طریقے پر چھوڑا تھا، اُس کی جگہ یہ بدعت لے لے گی کہ ایک ہی مملکت میں دو لوگ حکومت کر رہے ہوں گے۔

اِن روایتوں کی نسبت اگر خدا کے پیغمبر کی طرف صحیح ہے تو آپ نے جو کچھ فرمایا، وہ یہی تھا۔ اِن سے یہ بات کسی منطق سے بھی برآمد نہیں کی جا سکتی کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو دنیا میں ایک ہی حکومت قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور اسلام کے داعی اگر کبھی امریکہ، برطانیہ یا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں لوگوں کی اکثریت کو مشرف بہ اسلام کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اِن احادیث و آثار کی رو سے وہ اپنے ملک میں اپنی الگ حکومت قائم نہیں کر سکتے اور اگر کریں گے تو گناہ گار ہوں گے، جس طرح کہ اِس وقت پچاس کے قریب ممالک کے مسلمان ہو رہے ہیں۔

علما کو متنبہ رہنا چاہئے کہ خدا کے دین میں جو بات جتنی ہو، اُسے اتنا ہی رکھا جائے۔ یہ کسی عالم اور فقیہ اور محدث کا حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ایک ایسی بات کا مکلف ٹھہرائے جس کا مکلف اُن کے پروردگار نے اُن کو نہیں ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ میں نے لکھا ہے اور ایک مرتبہ پھر دہرا رہا ہوں کہ جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُن کی ایک ریاست ہائے متحدہ کا قیام ہم میں سے ہر شخص کی خواہش ہو سکتی ہے اور ہم اِس کو پورا کرنے کی جدوجہد بھی کر سکتے ہیں، لیکن اِس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم ہے جس کی خلاف ورزی سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

اسلام اور ریاست

جناب جاوید احمد غامدی کا ایک حالیہ مضمون ان دنوں دینی حلقوں میں زیر بحث ہے جس میں انہوں نے بنیادی طور پر یہ تصور پیش کیا ہے کہ اسلام کا خطاب فرد سے ہے سوسائٹی سے نہیں ہے، اور اسلام کا ریاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے اس وقت عالم اسلام میں جو تحریکیں نفاذ اسلام یا دنیا میں اسلام کا غلبہ قائم کرنے کے لیے کام کر رہی ہیں وہ اسلام کی روح کے مطابق نہیں ہیں۔ بہت سے اصحاب علم نے اس پر اظہار خیال کیا ہے اور میں بھی کچھ معروضات پیش کرنا مناسب خیال کر رہا ہوں۔ لیکن اب تک جن احباب کے مضامین اس حوالہ سے میری نظر سے گزرے ہیں وہ اپنے موقف کی وضاحت کی حد تک تو بالکل ٹھیک ہیں لیکن ان میں اس پہلو سے کسی حد تک خلاء محسوس ہو رہا ہے کہ غامدی صاحب کے افکار اور استدلال کے جواب کے لیے ہم اپنے مسلمات کی بنیاد پر بات کر رہے ہیں۔ جبکہ جن اصولوں اور حوالوں سے غامدی صاحب پر نقد کیا جا رہا ہے وہ سرے سے ان کے مسلمات میں شامل ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ انہوں نے مسلمات اور استدلالات کے باب میں امت کے چودہ سو سالہ اجماعی تعامل اور جمہور اہل علم کے موقف کو نظر انداز کرتے ہوئے کچھ اصول اور اصطلاحات از سر نو خود وضع کر لی ہیں، اور استدلال و استنباط کے زاویے بھی از سر نو طے کیے ہیں۔ اس لیے میرے خیال سے غامدی صاحب اور ان کے حلقہ سے مباحثہ و مکالمہ کرنے کے لیے مسائل و احکام سے پہلے ان کے اصول و مسلمات کو زیر بحث لانے کی ضرورت ہے۔ اور یہ واضح کرنا زیادہ ضروری ہے کہ امت کے اجماعی تعامل اور جمہور اہل علم کے مسلمات کو کراس کر کے اصول و مسلمات کی ''ری کنسٹرکشن'' وقت کا ضیاع اور بے جا تکلف ہونے کے ساتھ ساتھ استشراق کے عنوان سے مغرب کی اس علمی و فکری تحریک کی آبیاری کا باعث بھی بنتی ہے جو وہ گزشتہ تین صدیوں سے اسلام کے ساتھ امت مسلمہ کے اجتماعی اور معاشرتی تعلق کو کمزور کرنے کے لیے مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے۔

مثال کے طور پر ''سنت'' کا وہ مفہوم جو صحابہ کرامؓ سے لے کر اب تک پوری امت میں عام طور پر سمجھا جا رہا ہے اور اس پر معاشرتی طور پر عمل بھی ہو رہا ہے، اس پر غامدی صاحب کو اطمینان نہیں ہے۔ اس لیے انہیں سنت کا مفہوم اور دائرہ از سر نو طے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ سنت دراصل دین ابراہیمیؑ کی روایت کے تسلسل کا نام ہے۔ اس پر اور اس نوعیت کے بعض دیگر مسائل پر غامدی صاحب اور ان کے حلقہ کے ساتھ کچھ عرصہ قبل میرا تفصیلی مکالمہ ہوا تھا جو کتابی صورت میں الشریعہ اکادمی (پوسٹ بکس 331 جی پی او) گوجرانوالہ کی طرف سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ مگر اس وقت اس ساری بحث کو ایک طرف رکھتے ہوئے غامدی صاحب کے اس موقف کا کہ ''اسلام کا مخاطب صرف فرد ہے اور اسلام کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے'' ہم انہی کے طے کردہ اس اصول و منہج کی روشنی میں جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ ''سنت'' دین ابراہیمیؑ کی روایت کے تسلسل کا نام ہے۔ مگر اس موقع پر پہلے اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ دین ابراہیمیؑ کا سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے آغاز ہوا تھا، یا وہ بھی ماضی کے کسی تسلسل کا حصہ ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر اس تسلسل سے مراد وحی الٰہی اور سلسلہ نبوت ہے تو اس کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ اس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام کے جنت پر اترنے سے قبل ہی ہوگیا تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا علیہما السلام سے فرمایا تھا کہ اب تم زمین پر اتر جاؤ۔ وہاں تمہارے پاس میری طرف سے ہدایات آئیں گی جن کی پیروی پر تمہاری فلاح و نجات کا مدار ہوگا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانی سوسائٹی کی آبادی کے آغاز پر ہی واضح فرما دیا تھا کہ زمین پر انسانی سوسائٹی کی بنیاد وحی الٰہی پر ہوگی اور آسمانی تعلیمات ہی انسانی سوسائٹی کی فلاح و نجات کی واحد اساس ہوں گی (البقرہ 38)۔

جبکہ نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک جتنے پیغمبر بھی آئے ہیں انہوں نے فرد کو خطاب کرنے کی بجائے ''یا قوم'' کہہ کر خطاب کیا جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی تعلیمات کا خطاب ہمیشہ فرد کی بجائے قوم اور سوسائٹی سے رہا ہے، اور ان کی تعلیمات فرد، خاندان، سوسائٹی اور قوم کے تمام دائروں کا احاطہ کرتی آ رہی

ہیں لیکن اگر ماضی کے تسلسل سے خدانخواستہ قطع نظر کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے بات شروع کرنی ہے تو اس دائرہ میں بھی بات کو دیکھا جا سکتا ہے اور قرآن کریم سے ہی اس کی چند جھلکیاں انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں:

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے حضرت یوسف علیہ السلام نے جو ظاہر ہے کہ دین ابراہیمی پر ہی تھے، مصر پر ایک عرصہ حکومت کی ہے۔ یہ اقتدار انہوں نے اپنی اہلیت و امانت کا حوالہ دے کر خود طلب کیا تھا، وہ نبوت بھی کرتے تھے اور ان پر وحی بھی نازل ہوتی تھی۔ بلکہ اپنے بھائی حضرت بنیامین علیہ السلام کو اپنے پاس رکھنے کے لیے انہوں نے جو تدبیر اختیار کی تھی اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ''کذلك كدنا ليوسف'' کہ یہ تدبیر ہم نے انہیں سکھائی تھی۔ اس لیے یہ کہنا آخر کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے کہ وحی الٰہی کا اجتماعی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

☆ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو جب کوہ طور پر نبوت ملی تو ان کے منصب میں صرف افراد کی اصلاح شامل نہیں تھی بلکہ ''ان ارسل معنا بنی اسرائیل'' کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم اور غلامی سے نجات دلانا بھی ان کے فرائض میں شامل کر دیا تھا۔ اور وہ بنی اسرائیل کی دینی راہ نمائی کے ساتھ ساتھ ان کی جدوجہد آزادی کے قائد بھی بن گئے تھے۔

☆ وادی تیہہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں داخل ہونے کا جو حکم دیا تھا وہ محض سیر و سیاست کے لیے نہیں تھا بلکہ جہاد کا حکم تھا جس کا مقصد ''بیت المقدس'' پر دشمنوں کا قبضہ ختم کرا کے وہاں اپنی ریاست قائم کرنا تھا۔ اس کی تفصیلات قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اور بعد میں حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کی قیادت میں جہاد کے ذریعہ یہ سلطنت قائم بھی ہوگئی تھی۔

☆ حضرت طالوتؒ اور جالوت کی جنگ کا قصہ قرآن کریم نے خود بیان کیا ہے کہ جالوت بادشاہ کے جبر و ظلم سے نجات کے لیے جب بنی اسرائیل کے نوجوانوں نے مزاحمت کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنا بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست وقت کے پیغمبر علیہ السلام سے کی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طالوت کو بادشاہ بنانے کا اعلان کیا جس کا مطلب واضح ہے کہ ابراہیمی روایت کے تسلسل میں بادشاہ کا تقرر اللہ تعالیٰ کرتے تھے اور وہ وحی کے ذریعہ ہوتا تھا۔

☆ سورۃ المائدہ کی آیت ۴۴ تا ۵۰ میں اللہ رب العزت نے دین ابراہیمؑ میں نازل ہونے والی وحی کا ذکر کیا ہے۔ پہلے توراۃ کا تذکرہ فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور بنی اسرائیل کے علماء کرام توراۃ کے مطابق لوگوں کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ اور لفظ ''یحکم'' کا ارشاد فرمایا ہے جس میں فیصلہ اور حکومت دونوں شامل ہیں۔ اس کے بعد انجیل کا ذکر کیا ہے اور اہل انجیل کے لیے اپنے اس حکم کو بیان کیا ہے کہ وہ اپنے فیصلے انجیل کے مطابق کیا کریں۔ پھر ان کے ساتھ قرآن کریم کو جوڑا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ آپ کی طرف ہم نے کتاب نازل کی ہے اور اس لیے نازل کی ہے کہ ''ان احکم بینهم بما انزل اللہ'' آپ بھی وحی الٰہی کے مطابق لوگوں کے درمیان حکم کیا کریں۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ توراۃ، انجیل اور قرآن کریم تینوں کا نزول ''حکم'' کے لیے ہوا ہے۔ اور اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ (درجہ بدرجہ) کافر، فاسق اور ظالم ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وحی الٰہی کے مطابق فیصلے نہ کرنے کو ''حکم الجاہلیۃ'' سے تعبیر فرمایا ہے۔

☆ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم نے خلافت کے عنوان سے کیا ہے اور اس کا مقصد بیان کیا ہے کہ ''فاحکم بین الناس بالحق'' لوگوں کے درمیان حق کے مطابق حکم و فیصلہ کریں۔ حتیٰ کہ ایک مرحلہ پر کسی مقدمہ میں ان کے فیصلے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس مقدمہ میں ان کی بجائے حضرت سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ زیادہ صائب تھا، اور ''ففهمناها سليمان'' وہ ہم نے انہیں سمجھایا تھا، جو واضح کرتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت و ریاست کی بنیاد وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات تھیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق حکومت کرتے تھے۔

یہ بات کہ وحی الٰہی کا خطاب صرف فرد سے نہیں بلکہ خاندان، سوسائٹی اور قوم سے بھی ہوتا ہے اور ریاست و حکومت کا صحیح معیار ہمیشہ آسمانی تعلیمات رہی ہیں، قرآن کریم میں اس کے دیگر شواہد بھی موجود ہیں۔ مگر صرف چند مثالوں پر اکتفاء کرتے ہوئے یہ عرض کریں گے کہ اگر ''سنت'' کو صرف دین ابراہیمیؑ کی روایت تک ہی بالفرض محدود سمجھ لیا جائے تو اس دائرہ میں بھی سوسائٹی کے اجتماعی مسائل کو آسمانی تعلیمات کے دائرہ سے خارج قرار دینا اور ریاست کو وحی الٰہی کی پابندی سے آزاد سمجھنا قطعی طور پر غیر واقعی اور غیر منطقی بات ہے۔ جبکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اس تسلسل کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ایک نبی کے چلے جانے کے بعد دوسرا نبی آ جاتا تھا۔ میرے بعد چونکہ کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اس لیے میرے بعد خلفاء ہوں گے جو اس تسلسل کو جاری رکھیں گے۔ اس پس منظر میں ہماری گزارش ہے کہ اسلام کی بنیاد پر ریاست کا قیام اور حکومت کی تشکیل، نیز سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں آسمانی تعلیمات کا نفاذ اسلام کی اصل روح اور اس کے مقاصد میں سے ہے۔ اس لیے اسے لفظی موشگافیوں اور فکری تانوں بانوں کے ذریعے دھندلکوں میں گم کرنے کی کوشش کو اسلام کی صحیح تعبیر یا امت مسلمہ کی خدمت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ☆

اسلام اور ریاست......(2)

آسمانی تعلیمات کا مخاطب صرف فرد ہے یا سوسائٹی اور قوم بھی ہے، نیز اسلام کا ریاست کے ساتھ کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ ان دو سوالوں کے حوالہ سے محترم جناب جاوید احمد غامدی کے ایک حالیہ مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے انہی کے فلسفہ کے مطابق دین ابراہیمیؑ کی روایت سے کچھ جھلکیاں پیش کی تھیں، اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے کچھ مزید مناظر قارئین کے سامنے لانے کو جی چاہتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور ان کے ساتھ بابل سے فلسطین کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی کے حکم پر اردن کے علاقہ کی طرف بطور نبی تشریف لے گئے تھے۔ انہیں جس قوم سے واسطہ پڑا وہ کافر و مشرک ہونے کے ساتھ ساتھ ''ہم جنس پرستی'' کی لعنت میں بھی مبتلا تھی، جس کی بہت سی تفصیلات قرآن کریم نے بیان کی ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اس علاقہ کے لوگوں کو فرداً فرداً توحید و عبادت کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ''ہم جنس پرستی'' کے معاشرتی جرم کے خاتمہ کے لیے بھی جدوجہد کی۔ اس سلسلہ میں قوم سے جو باتیں انہوں نے فرمائیں اور آزمائش کے جن مراحل سے گزرے وہ اگر آج کے دور میں ہوتا تو انہیں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار دے کر میڈیا اور لابنگ کی قوتیں اپنا سب سے بڑا ہدف قرار بنا لیتیں۔ اور مغربی ملکوں کے بہت سے شہروں میں انہیں مخالفانہ مظاہروں کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کا کام صرف فرد کی اصلاح نہیں بلکہ معاشرہ کی مجموعی اصلاح اور معاشرتی خرابیوں کا سد باب بھی انبیاء کرامؑ کے فرائض منصبی میں شامل رہا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاصر بلکہ خسر بزرگوار تھے۔ اقبالؒ نے ان کے باہمی

تعلق کو اس لہجے میں بیان کیا ہے کہ:

؎ اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

وہ مدین کے علاقہ کی طرف مبعوث ہوئے اور اس قوم کا سامنا کیا جو ''تجارتی کرپشن'' میں مبتلا تھی اور سوداکاری میں بددیانتی اس کے گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی جدوجہد کو صرف فرد کی اصلاح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس معاشرتی جرم کے خلاف بھی آواز بلند کی اور تجارتی بددیانتی کو دنیا و آخرت کا خسارہ قرار دے کر قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید و عبادت کی طرف دعوت دینے کے ساتھ ساتھ تجارتی بددیانتی سے باز آجانے کی بھی تلقین کی۔ حتیٰ کہ ان کی اس دعوت پر قوم کے لوگوں نے جو تبصرہ کیا وہ قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

''اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ تم ہمیں اس حق سے محروم کر دو کہ ''ہم اپنے مال و دولت میں اپنی خواہش کے مطابق تصرف کر سکیں۔''

یہ حلال و حرام کے تصور سے بے نیاز اسی ''فری اکانومی'' کی صدائے اولین تھی جو آج پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور جسے جواز فراہم کرنے کے لیے ہمارے بہت سے دانش وروں کو مذہب کے معاشرتی کردار کی نفی کرنا پڑ رہی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت دنیا کی مسلمہ بادشاہتوں میں سے ہے اور اسی سلطنت کی یاد ابھی تک مٹھی بھر یہودیوں کو بے چین رکھے ہوئے ہے۔ اس بادشاہت کے متعدد مناظر قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں، جن میں ایک کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ''ہدہد'' نے آکر خبر دی کہ آپ کے پڑوس میں ایک سلطنت ہے جس کا آپ کو علم نہیں ہے۔ میں وہاں سے ہو کر آیا ہوں، ایک خاتون وہاں حکمران ہے اس کا تخت بڑا عظیم ہے اور وہ قوم اللہ تعالیٰ کی بجائے سورج کی پرستش کرتی ہے۔ یہ خبر سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو پہلا پیغام اس قوم کی ملکہ کی طرف بھیجا وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد صرف دو جملوں پر مشتمل تھا:

''مجھ پر سرکشی نہ کرو اور اطاعت قبول کر کے میرے پاس آجاؤ۔''

ایک اجنبی قوم جس کے ساتھ اس سے قبل کسی قسم کے مثبت یا منفی تعلقات نہیں تھے، اچانک اس طرح کا پیغام بھیجنے کا مطلب اس کے سوا کیا بنتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول اور خلیفہ حضرت داؤد علیہ السلام کے جانشین تھے۔ اور ''خلیفہ'' ہونے کی حیثیت سے اپنی قوم کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں کی اصلاح بھی ان کی ذمہ داریوں میں شامل تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہ قوم کفر و شرک میں مبتلا ہے، اس کی آزادانہ حیثیت کو سرکشی سے تعبیر کرتے ہوئے پہلا پیغام ہی اطاعت قبول کرنے کا بھجوا دیا۔ قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات کے مطابق قوم سبا کی ملکہ بلقیس نے اس کے جواب میں صلح و مفاہمت کا پیغام بھجوایا۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے مسترد کرتے ہوئے اس ملک کے خلاف ''فوج کشی'' کی دھمکی اور ذلیل کر کے ملک سے باہر نکال دینے کا الارم دیا جس پر ملکہ سبا نے اسلام قبول کر کے غیر مشروط اطاعت کا اظہار کیا اور قوم کے نمائندوں کے ہمراہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوگئی۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ واقعہ اگر آج کے دور میں ہوتا تو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا باقاعدہ اجلاس ہوتا اور مختلف ملکوں کی مشترکہ فوج تشکیل دے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ملک پر چڑھائی کر دی جاتی کہ آپ کو دوسری قوموں کی اصلاح و ایمان کی کیا فکر پڑی ہوئی ہے؟

؎ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مکالمے کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں چند سال قبل امریکہ کی ریاست ورجینیا کے ایک تعلیمی ادارے میں ٹھہرا ہوا تھا کہ کچھ حضرات ملنے کے لیے آئے اور مختلف مسائل پر گفتگو کی۔ دوران گفتگو انہوں نے فرمایا کہ مغربی معاشروں میں مذہب کی طرف واپسی کے رجحانات بڑھتے جا رہے ہیں اور اب واضح محسوس ہونے لگے ہیں، جس سے یہاں کے بعض ارباب حل و عقد کو پریشانی ہے کہ نفس مذہب کی واپسی تو کوئی ایسی بات نہیں ہے لیکن کیا مذہب سوسائٹی میں واپس آکر اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں پھر سے دخل دینا تو شروع نہیں کر دے گا؟ ان کا کہنا تھا کہ مغرب بالخصوص امریکہ کی دانش گاہوں میں اس نکتہ پر ریسرچ ہو رہی ہے اور مختلف لوگوں کا نقطہ نظر معلوم کیا جا رہا ہے۔

یہ پس منظر بتا کر انہوں نے میری رائے دریافت کرنا چاہی تو میں نے عرض کیا کہ دوستو! اگر تو واپس آنے والا مذہب ''فی الواقع مذہب'' ہوا تو وہ ضرور مداخلت کرے گا۔ اس لیے کہ نبی اور مذہب صرف فرد کی اصلاح کے لیے نہیں آتے بلکہ سوسائٹی کی اصلاح بھی ان کے مقاصد میں شامل رہی ہے۔ اب قرآن ہی کو لے لیجیے، وہ صرف فرد کی بات نہیں کرتا، خاندان کی بات بھی کرتا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ احکام و قوانین دیتا ہے۔ جبکہ خاندان کے دائرہ سے نکل کر تجارت، عدالت، معیشت، سیاست اور دیگر قومی شعبوں کے لیے بھی اس کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ یہ سب ہدایات قرآن کریم نے ایک ہی لہجہ میں دی ہیں۔ انہیں لازمی اور اختیاری مضامین میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے قرآن کریم نے یہ بات پوری صراحت کے ساتھ کہہ دی ہے کہ: ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔'' ☆

اسلام اور ریاست پر ایک معروضی نظر

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

☆☆☆

اسلام وہ واحد دین ہے جو اپنے ماننے والوں سے ہر قدم پر یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ خالق کائنات کی نازل کردہ ہدایات و احکام کو غور، فکر اور تحقیق کرنے کے بعد اختیار کریں۔ اسی بنا پر قرآن و حدیث اسلام کو مذہب نہیں بلکہ دین قرار دیتے ہیں۔ ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے'' (آل عمران ۱۹) ین قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں اللہ کی بندگی اور اللہ کی حاکمیت قائم کرنے سے عبارت ہے۔ یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ قرآن کریم میں خلافت کی اصطلاح اپنی مختلف شکلوں میں ۱۴ مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ سورۃ النور، سورۃ الاعراف اور سورۃ الانعام میں استخلاف کی اصطلاح کی وضاحت قرآن کریم خود کر رہا ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ایک قوم کو خلافت یا حکمرانی کا دیا جانا۔

دیگر مقامات پر اور خود تخلیق آدم کے واقعہ میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ملائکہ سے انسان کا تعارف خلیفہ کی اصطلاح سے کرایا۔ ظاہر ہے کہ قرآن کریم ایک نہیں ۱۴ مقامات پر اس اصطلاح کو اس کی مختلف شکلوں میں استعمال کر رہا ہے تو اسے اسلامی اصطلاح ہی ہونا چاہیے۔ یہ سوال اٹھانا بھی ہر غیر مسلم اور مسلمان کے لیے ممنوع نہیں کہ ''کیا اسلام میں ریاست کا کوئی مذہب ہے؟'' یا دوسرے الفاظ میں کیا اسلامی ریاست ایک سیکولر ریاست ہے؟ یا ایک وقت میں یورپ میں پائی جانے والی کلیسائی ریاست (Theocracy) کے مماثل ہے؟ گو یہ سوال نہ تو نیا ہے اور نہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے ایک نئی بحث یا ردِ بیانیہ یا صرف بیانیہ کا عنوان دے کر ندرت خیال تصور کر لیا جائے۔ یہ بات سینکڑوں مرتبہ مستشرقین اور مغربی جامعات سے اسلامیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آنے والے دانشور دہراتے رہے ہیں۔ غیر محسوس طور پر وہ تجربی طریق تحقیق پر ایمان بالغیب لانے کے بعد اسی عینک سے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں یا اسلام سیکولر نظر آتا ہے یا تھیو کریٹک۔ اس لیے ہم نے یہ گزارش کی کہ اسلام اور ریاست کے موضوع پر ایک معروضی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ یہ مفروضہ کہ ''اسلام کی دعوت اصلاً فرد کے لیے ہے'' ایک بنیادی مغالطہ ہے۔ کم از کم قرآن کریم اور سنت مطہرہ اس تصور کو پیش نہیں کرتے۔ اسلام کا تصور عبادت دیگر مذاہب سے جوہری طور پر مختلف اس بنا پر ہے کہ یہاں مسئلہ محض ذاتی نجات کا نہیں ہے بلکہ اپنے ارد گرد کے افراد کی اصلاح اور اخروی کامیابی کی فکر کا ہے۔ اسلام کے تصور عبادت کی روح اجتماعیت میں ہے اور توحید کا مطالبہ ہے کہ کاروبار حیات کے تمام شعبوں میں اللہ کی حاکمیت اور حتمی اقتدار کو نافذ کیا جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام فرد کا تو دین ہو لیکن جس نظام سیاسی میں وہ رہے وہ مشرکانہ، جاہلانہ یا مادہ پرست ہو۔ اگر ہم قرآن کریم سے اس کا جواب پوچھیں تو صاف طور پر یہ بات کہی گئی ہے مقتدرِ اعلیٰ صرف خدا کی ذات ہے۔ حاکمیت کا دائرہ اثر صرف ذاتی معاملات میں نہیں بلکہ یکساں طور پر سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، قانونی اور بین الاقوامی معاملات میں بھی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مسجد میں تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعظم، اعلیٰ اور اکبر ہو لیکن پارلیمنٹ میں پارلیمان اعلیٰ، اکبر اور اعظم بن جائے اور پارلیمان طے کرے کہ اسلام کے کس حکم کو ماننا اور نافذ کرنا ہے اور کس کو نظر انداز کر دینا ہے۔ نہ یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ و تعالیٰ مسجد میں تو سجدہ کا مستحق ہو لیکن تھوک بازار میں کھوٹے سکے سجدے کے مستحق بن جائیں یا نام نہاد ثقافتی دنیا تہذیب کا معیار بن جائے۔ اگر پھر بھی اصرار کیا جائے تو معروضی طور پر اس دور کے معروف مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی تالیف ''اسلامی ریاست'' کا مطالعہ کر لیا جائے۔ کم از کم وہ حضرات جو مجازی طور پر انہیں کسی وقت اپنا استاد مانتے رہے ہوں اس کتاب کا مطالعہ ان کے تصور خلافت کے خطوط پر چھائی ہوئی دھند کو بآسانی دور کر دے گا۔ یہ کہنا بھی کہ ''اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے جس طرح کے عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ تحریک پاکستان کے مخالفین کا استدلال یہی تو تھا کہ مسلمان کوئی الگ قوم نہیں ہیں چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، مولانا حسین احمد مدنی مرحوم اور جمعیت علماء ہند کے دیگر زعماء نے اس تعبیر پر ایمان رکھتے ہوئے انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دیا جبکہ علامہ اقبال، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا مودودی نے مسلمانوں کے ایک الگ قوم ہونے کے تصور کی نہ صرف حمایت کی بلکہ مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''مسئلہ قومیت'' میں جمعیت علماء ہند کے تصور قومیت کو قرآن و سنت کی روشنی میں رد کیا اور مسلم لیگ نے اس کتاب کو بڑے پیمانے پر ملک میں تقسیم کیا۔ مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کے حوالہ سے قائداعظم محمد علی جناح کی ایسوسی ایٹڈ پریس امریکہ کے نمائندہ سے گفتگو تصور کی وضاحت کرتی ہے۔

The difference between the Hindus and Muslims is deep-rooted and ineradicable, we are a nation with our own distinctive culture and civilization, language and literature, art and architecture, names and nomenclature, sense of value and proportion, legal laws and moral codes, customs and calendar, history and traditions, aptitude and ambitions, in short we have our own distinctive outlook on life and of life. By any canons of international law we are a nation.

[Interview to Preston Crom of Associated Press of America, Bombay, July 1, 1942, K.A.K Yusufi, edit, "Speeches, Statements and Messages of the Quaid-e-Azam", Lahore, Bazm-e-Iqbal, 1996, Vol III, P. 1578.

قرآن کریم اہل ایمان کو ایک دوسرے کا بھائی اور ایک سیسہ پلائی دیوار اور ''خیر امت'' یا ''امت وسط'' کے نام سے پکارتا ہے۔ اس امت کی بنیاد نہ رنگ ہے، نہ نسل، نہ زبان، نہ جغرافیائی سرحدیں۔ علامہ اقبال کی مولانا حسین احمد مدنی مرحوم پر شدید تنقید اور یہ سوال کہ ہند میں مسلمان سید بھی ہیں مرزا بھی ہیں افغان بھی ہیں لیکن یہ بھولے ہوئے ہیں کہ وہ مسلمان بھی ہیں، نسل اور ذات پر مبنی قومیت کے علمبرداروں کے موقف کو مسترد کرتا ہے۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کر کے اس غلط فہمی کی اصلاح کر دی ہے کہ ''ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا'' چنانچہ فرمایا گیا: ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ (نظام) نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔'' (الحج ۲۲:۴۱)

ان چار اہم کاموں کو کون کرے گا؟ کون زکوۃ وصول کر کے تقسیم کرے گا؟ محصلین زکوۃ کا تقرر کون کرے گا؟ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انفرادی ہے تو پھر یہ کیوں کہا کہ جب انہیں اقتدار بخشیں گے تو وہ یہ کام کریں گے؟ تحقیق کی دیانت کا تقاضا ہے کہ غلط مبحث نہ کیا جائے اور قرآن کریم اور سنت مطہرہ کے واضح احکام کو بلا کسی دلیل کے مختلف فیہ نہ بنایا جائے۔ اس طرز فکر کو نہ تو جدت سے اور نہ اجتہاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اختلاف رائے بلا شبہ امت کے لیے رحمت ہے لیکن جب تک وہ ادب اختلاف کے دائرہ میں ہو۔

اسلام اور ریاست

تحریر: ابتسام الٰہی ظہیر

روزنامہ جنگ پاکستان کا ایک اہم قومی اخبار ہے۔ اس اخبار میں آج کل ریاست اور مذہب کے تعلق کے حوالے سے ایک اہم بحث کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس عنوان کی اہمیت کے پیش نظر میرا ارادہ تھا کہ میں بھی اس موضوع پر اپنی گزارشات کو نذر قارئین کروں۔ 22 جنوری کو اسی عنوان پر آراء پڑھنے کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ قرآن وسنت کی روشنی میں فی الفور میں اپنی معروضات کو قارئین کے سامنے رکھوں اور فیصلہ قارئین خود کرلیں گے کہ حقیقت کیا ہے۔ صاحب مضمون نے اپنے مضمون میں مذہب اور ریاست کے باہمی تعلق کی نفی کی ہے اور اسلامی احکامات اور شریعت کو افراد کے عمل کی اصلاح تک محدود رکھا ہے۔ آپ نے اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے ایک قوم یا بالفاظ دیگر ایک امت ہونے کو بھی سیاسی اسلام کے ترجمان مفکرین کی فکر کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔

آپ نے اپنے مضمون میں خلافت یا مسلمانوں کی عالمی ریاست کے تصور کو بھی قبول نہیں کیا اور اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ کوئی بھی گروہ اگر اسلام کا دعویدار ہو تو اس کے عقائد خواہ کسی بھی قسم کے ہوں اس گروہ یا جماعت کو مسلمان ہی تصور کرنا چاہیے۔ علماء ان کی غلطی کی نشاندہی کر سکتے ہیں لیکن ان کو کسی بھی طور پر کافر یا مرتد قرار نہیں دے سکتے۔ آپ نے اسلامی سزاؤں کے حوالے سے اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ سزائے موت کا اطلاق صرف قتل یا فساد فی الارض کے جرائم پر ہوگا اور باقی جرائم پر یہ سزائیں نہیں دی جاسکتیں۔ ان صاحب کے نزدیک نفاذ شریعت کا مطالبہ مغالطہ انگیز ہے اور کوئی بھی قانون پارلیمان کی توثیق کے بغیر ریاستی قانون کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا چاہے اس کے پیچھے کتنی بھی بڑی دلیل اور علماء کی جماعت کا مطالبہ بھی موجود کیوں نہ ہو۔ آپ کے نزدیک پارلیمان اور عوام کی اکثریت ہی کسی قانون کا جواز بن سکتی ہے۔ آپ نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ حکومت کسی بھی معاملے پر سختی سے عملدرآمد نہیں کرواسکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے جہاد کو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ مخصوص کر کے بعد میں اس کا اطلاق صرف ظلم کے خاتمے پر کیا ہے۔ آپ نے اپنے مضمون میں اور بھی کئی نکات پر بحث کی ہے لیکن مجموعی طور پر میں نے اہم نکات کا ذکر کر دیا ہے۔

زیر نظر مضمون میں میری یہ کوشش ہوگی کہ قرآن وسنت کی روشنی میں ان کے دلائل کا تجزیہ کیا جائے تا کہ حقیقت حال کو واضح کیا جاسکے۔

جہاں تک تعلق ہے ریاست کے مذہب کا یا مذہبی احکامات افراد سے متعلق ہونے کا، تو قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے اس تاثر کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ العمران کی آیت نمبر ۱۹ میں ارشاد فرمایا ''بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے۔'' اسی سورۃ کی آیت نمبر ۸۵ میں ارشاد ہوا ''جو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔'' یہ آیات واضح کرتیں ہیں کہ ہر فرد کو اسلام اختیار کرنا چاہیے چاہے وہ عام فرد ہو یا کوئی حاکم۔ اسی طرح سورۃ نساء کی آیت نمبر ۵۹ میں ارشاد ہوا ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اطاعت کرو اس کے رسول ﷺ کی اور ان حکام کی جو تم میں سے ہوں۔'' سوچنے کی بات یہ ہے کہ حاکم یا اولوامر مسلمانوں کی جماعت میں سے ہوگا تو ظاہری بات ہے مسلمان ہوگا۔ ان آیات کے جواب میں اگر کوئی سوال اٹھاتا ہے کہ ان آیات میں ریاست یا حکومت کے مذہب کا ذکر نہیں بلکہ افراد یا اولوامر کے مذہب کا ذکر ہے اور ریاست اپنی ساخت کے اعتبار سے مذہبی معاملات سے لاتعلق ہی رہے گی۔ تو ان کو مزید وضاحت کے لیے سورۃ مائدہ کی آیت نمبر ۴۴، ۴۵ اور ۴۷ پر غور کرنا چاہیے جن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات یعنی اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور بالخصوص قرآن کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو وہ منکرین، ظالموں اور فاسقوں میں شامل ہے۔ یہ آیات مسلمان حکمرانوں کو اس امر کا پابند بناتی ہیں کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کریں اور احکامات الٰہی سے انحراف کر کے اپنا شمار منکرین، ظالموں اور گناہگاروں میں نہ کروائیں۔

صاحب مضمون نے مسلمانوں کے ایک قوم یا بالفاظ دیگر ایک امت ہونے کی بھی نفی کی ہے اور ان کو مختلف قومیتوں میں تقسیم کرنے کو درست اور جائز قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ حجرات میں مسلمانوں کو شناخت کے لیے گروہوں اور قبائل میں تقسیم ہونے کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس تقسیم کی حیثیت شناخت سے کچھ زیادہ نہیں۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک امت اور ملت کی حیثیت سے ہی پکارا ہے۔ کہیں تو قرآن میں ان کو امت وسط قرار دیا گیا، کہیں خیر الامم قرار دیا گیا، کہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت قرار دیا گیا اور سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر ۹۲ میں وضاحت سے ارشاد فرمادیا کہ ''یقیناً یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پھر تم میری ہی عبادت کرو۔'' انہوں نے اس سلسلے میں قرآن وسنت کے واضح دلائل کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان کے قائدین کے دوقومی نظریے کو بھی قبول نہیں کیا۔ کاش وہ مصور پاکستان کے ان اشعار پر ہی غور فرمالیتے:

اپنی ملت پہ قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پہ انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

جہاں تک تعلق ہے خلافت کا تو ''استخلاف فی الارض'' کا ذکر کتب احادیث سے کہیں پہلے ہی قرآن مجید میں موجود ہے۔ سورۃ نور کی آیت نمبر ۵۵ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلافت دے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور ان کے لیے دین کو قائم کردے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے اور ان کے خوف کو امن میں ضرور بدلے گا۔'' کتب احادیث کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد تیس سالہ دور کو خلافت راشدہ کا دور قرار دیا ہے۔ اسی طرح جہاں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کسی نبی کی آمد کی نفی فرمائی وہیں پر آپ نے اس بات کا بھی ذکر فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے خلفاء پوری اسلامی سلطنت کے بیک وقت امیر رہے اور جغرافیائی وسعت کے باوجود مسلمانوں کا دارالخلافہ تمام علاقوں کے امور کا نگران رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق روایات مسلمانوں کی عالمگیر سلطنت کے دوبارہ قیام کا اشارہ کرتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کے حوالے سے ارشاد فرمایا کہ وہ عادل حکمران ہوں گے۔ اسی طرح حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بھی ارشاد ہوا کہ وہ زمین سے ظلم اور جور کا خاتمہ کر کے اس کو عدل سے بھر دیں گے۔ زمین پر جاری ظلم کے خاتمے اور اس کو عدل سے بھر دینے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کو دوبارہ عالمگیر سیاسی عروج حاصل ہوگا۔

جہاں تک تعلق ہے کہ علمائے امت کسی گروہ کو خواہ اس کے عقائد کسی بھی قسم کے ہوں غیر مسلم قرار نہیں دے سکتے یہ نظریہ بھی ہر اعتبار سے مذموم ہے۔ اس استدلال کو درست مان لیا جائے تو عقیدہ ختم نبوت کا انکار کرنے والے تمام گروہ اسلام کے دامن میں پناہ لینے کے قابل ہو جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک واضح ہے کہ میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔ یہ فرمان مبارک اجماع امت کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور مسلمان بحیثیت مجموعی جب بھی کوئی فیصلہ کریں تو مومنوں کے راستے، فیصلے اور طریقے کی مخالفت بجائے خود ایک بہت بڑی گمراہی ہے۔ تمام مکاتب فکر کے جید اور نمائندہ علماء نے ختم نبوت کا انکار کرنے کی وجہ سے مرزائیوں (قادیانیوں) کو کافر قرار دیا ہے۔ اب مسلمانوں کے اس اجتماعی فیصلے سے انحراف کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ نساء کی آیت نمبر ۱۱۵ میں ارشاد فرمایا ہے ''اور جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی اور اہل ایمان کے اور مومنوں کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرے گا تو ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا پھر اسے جہنم میں داخل کر دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔'' اہل ایمان کے راستے سے انحراف کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے اس بات کو بھی رکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر وہ آئین، قانون اور پارلیمان ہی کو حرف آخر سمجھتے ہیں تو کم از کم ختم نبوت کے منکرین کے بارے میں پارلیمان اور آئین کے فیصلے کو قبول فرمائیں کہ یہ گروہ اور جماعتیں صرف علماء کے اتفاق کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوئیں بلکہ پارلیمان، آئین اور قانون میں بھی ان گروہوں اور جماعتوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے۔

جہاں تک تعلق ہے اسلامی سزاؤں کا کہ صرف قتل اور فساد فی الارض کے باب میں سزائے موت درست ہے تو یہ بات بھی صحیح نہیں۔ شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لیے حد رجم ہونے کا ذکر وضاحت سے کتب احادیث میں موجود ہے۔ شبیبہ غامدیہ کا رجم فساد فی الارض کی تعزیر کے طور پر نہیں ہوا تھا بلکہ زنا کی حد کے طور پر ہوا تھا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ شبیبہ غامدیہ کو زنا کے ارتکاب پر پکڑا نہیں گیا تھا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ کو اس سزا کے لیے پیش کیا تھا۔

اسی طرح توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بھی کتب احادیث وسیرت میں متعدد واقعات مذکور ہیں کہ جن لوگوں نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا تھا ان کو زمانہ رسالت ہی میں سزائے موت دی گئی تھی اور اگر آئین اور قانون ہی کا حوالہ ان صاحب کو مطمئن کرسکتا ہے تو آپکو 295a,b اور c پر غور کر لینا چاہیے کہ توہین رسالت کی سزا، سزائے موت کو تو ہمارا آئین اور قانون بھی درست تسلیم کرتا ہے۔

نفاذ شریعت کا مطالبہ کسی بھی اعتبار سے مغالطہ انگیز نہیں بلکہ یہ تو وہ اہم ذمہ داری ہے جو حکمرانوں کو اللہ تعالیٰ نے خود تفویض کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ حج کی آیت نمبر ۴۱ میں ارشاد فرماتے ہیں ''یہ لوگ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔'' یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حکمران اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ تمام معروف کاموں کا حکم دیں گے اور تمام منکرات سے روکیں گے۔ اس لیے ایسے معاملات کی تنفیذ کے مطالبے کو مغالطہ سمجھنا جن کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے بجائے خود ایک مغالطہ ہے۔ اس آیت میں اس نکتے کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ حکمرانوں کی ذمہ داریاں صرف نظام صلوٰۃ اور نظام زکوٰۃ تک محدود نہیں بلکہ تمام معروف کاموں کا اجراء اور تمام منکرات کاموں کی روک تھام بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ حدود اللہ کے نفاذ کے ساتھ ساتھ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مسلمان حکمران وقت کی مصلحت کے اعتبار سے تعزیرات کا استعمال کرنے کے بھی مجاز ہیں۔

صاحب مضمون نے قوانین کا بڑا ماخذ قرآن وسنت کے بالمقابل پارلیمان کو قرار دیا ہے گویا کہ پارلیمان قرآن و سنت کے تابع نہیں بلکہ قرآن وسنت پارلیمان کے تابع ہوں گے اس کا مطلب یہ کہ افراد اور ارکان پارلیمان کو قانون سازی کا لامحدود اختیار حاصل ہوگا اور مخلوق کے اختیارات اس مسئلے میں خالق کے اختیارات پر بھی سبقت لے جائیں گے یہ تصور آج سے پہلے کسی بھی مسلمان دانشور نے پیش نہیں کیا۔ مغربی جمہوریت اور پارلیمان کو قانون سازی کے لامتناہی اختیارات حاصل ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کی پارلیمان اور شوریٰ کا تعلق ہے تو وہ اللہ اور اسکے رسولؐ کے احکامات کی پابند ہے اور یہی وہ اصول ہے جسے قرار داد مقاصد اور 73 کے آئین میں طے کر لیا گیا تھا۔ مشاورت کی آڑ میں الحادی جمہوریت کی ترجمانی نہ صرف یہ کہ قرآن وسنت کی واضح تعلیمات سے متصادم ہے بلکہ اس استدلال کے ذریعے اسلامی جمہوریت، نظریہ پاکستان اور آئین پاکستان سے بھی انحراف کیا گیا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان صاحب نے قرآن و سنت کی بالادستی کو عالمی سطح پر سیاسی فرقہ واریت کی بنیاد قرار دیا ہے۔

جہاں تک جہاد کا تعلق صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے ساتھ تھا تو یہ استدلال بھی خود ساختہ ہے۔ قرآن مجید میں جہاد سے متعلق بیسیوں آیات ہیں اور خلفائے راشدین، صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین ہر دور میں جہاد کرتے رہے یہ بات درست ہے کہ جہاد نظم اجتماعی یا حکومت کے ذریعے ہی ہونا چاہیے لیکن یہ شرط جہاد کے معطل یا موقوف ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ حدیث پاک میں وضاحت ہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بھی اہل ایمان کی ایک جماعت دجال سے قتال کرے گی۔ قرآن وسنت کی نصوص، کتب سیرت اور تاریخ میں وہ پیغام جو مذہب اور ریاست کے حوالے سے موجود تھا میں نے اس کو خلوص نیت سے قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن وسنت اور احکامات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

ترقی کے ماڈل اور متبادل بیانیہ

آدمی سوچتا ہے تو حیرت اسے گھیر لیتی ہے۔ عالمِ اسلام میں حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر ترقی کے بہت سے ماڈل پیش کیے گئے۔ انفراسٹرکچر، ٹیکنالوجی، مذہب، عسکریت، گڈ گورننس۔۔۔۔ ان سب کو بنیاد مان کر ترقی کے مختلف ماڈل سامنے لائے گئے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے موجودہ حکمران یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک مضبوط انفراسٹرکچر کی تعمیر، ترقی کی بنیادی ضرورت ہے۔ مہاتیر محمد کا خیال بھی یہی تھا؛ تاہم وہ اس کے ساتھ گڈ گورننس کو بھی لازم سمجھتے تھے۔ جہادی تنظیموں کا ماڈل یہ ہے کہ عسکری جدوجہد سے پہلے مسلمان ملکوں کے اقتدار پر قبضہ کرو اور پھر سامراجی قوتوں سے نجات حاصل کرو۔ میں سوچتا رہا کہ کہیں کوئی ایسا ماڈل بھی سامنے آیا ہے جس میں علم کو ترقی کی بنیاد مانا گیا ہو؟ میری حیرت کا سبب یہ ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔

مغرب کے عروج کا نقطۂ آغاز احیائے علوم کی تحریک (Renaissance) ہے۔ ایک علمی وفکری تحریک جس نے غور وفکر کے قدیم اسالیب (paradigms) کو مسترد کرتے ہوئے، علوم کی نئی بنیادیں اٹھائیں۔ اہلِ علم اس تحریک کے چند خواص بیان کرتے ہیں۔ ایک ہیومن ازم، جس نے عقل اور تجرباتی شواہد کی اساس پر خیالات کو پرکھنے کا رجحان پیدا کیا۔ دوسرا آرٹ کہ اٹلی میں مصوری کی دنیا ایک انقلاب سے گزری۔ یہ حقیقت پسندی کی بنیاد پر فنون کی تشکیلِ نو تھی۔ تیسری' سائنس جس نے کائنات پر غور وفکر کو نئے زاویے سے دیکھا۔ طبیعی علوم میں نئے نظریات کو فروغ ملا۔ زمینی مرکزیت (Geocentric) تصور کے لیے اس خیال نے ایک بڑا چیلنج اٹھا دیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ چوتھا مذہب، جس کے قدیم تصور کو مسترد کر دیا گیا۔ اس کا حاصل سیکولرازم تھا۔ پانچواں خود شناسی۔ اس عہد میں لوگوں نے تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا اور قرونِ وسطیٰ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا تعلق عہدِ قدیم سے قائم کیا۔ یوں اپنے دور کو پہچانا اور اس کو ممتاز کیا۔

احیائے علوم کی تحریک کا حاصل آج کا مغرب ہے۔ یہ اس تحریک کے نتیجے میں وجود میں آنے والے ایک نظامِ اقدار پر کھڑا ہے اور اس نے دو صدیوں میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان اقدار کی بنیاد پر ایک دنیا آباد کی جا سکتی اور اسے کامیابی سے طویل عرصہ تک قائم رکھا جا سکتا ہے۔ میرا احساس ہے کہ دنیا میں ترقی کے یہ فطری اصول ہیں جن کو اہلِ مغرب نے دریافت کیا۔ یہ ترقی کا وہ ماڈل ہے جس کی بنیاد علم ہے۔ گزشتہ چند صدیوں میں یہ مغرب کی علمی برتری ہے جس نے اسے دنیا کا امام بنا رکھا ہے۔ ہمارے پاس بھی ترقی کا یہی ماڈل ہے۔ اس دنیا کے باب میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اس سنت کا اطلاق سب انسانوں پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے مظاہر میں کچھ خواص رکھے ہیں جو ان کو جان لیتا اور مصرف میں لے آتا ہے، فطرت اس کی خدمت پر مامور ہو جاتی ہے۔ جب کسی نے توانائی کے اصول کو جان لیا اور ایک ایٹم کے جگر کو چیر کر اس میں چھپی توانائی کو دریافت کر لیا تو اب یہ توانائی اس کے حکم کے تابع ہے۔

ہم اگر ترقی کے اس ماڈل کو اپنائیں گے تو اس کا مطلب نقالی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں جب علوم کے احیا کی کوئی تحریک اٹھے گی تو اس کے خدوخال لازم نہیں کہ وہی ہوں جو مغرب میں سامنے آئے؛ تاہم یہ واضح ہے کہ ہمیں انہی خطوط پر سوچنا ہوگا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ مذہب، سماج، سیاست، آرٹ اور اپنے عہد کے جن تصورات پر ہم کھڑے ہیں، ان کو برقرار رکھتے ہوئے، ترقی کا کوئی امکان نہیں۔ ہمارے ہاں اس امرِ واقعہ کی تفہیم نہیں ہے۔ ہم اکثر اس کے اسباب خارج میں تلاش کرتے ہیں۔ یوں ترقی کے وہ ماڈل پیش کیے جاتے ہیں جو کسی طرح نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے۔ میں اس سے بڑھ کر یہ کہتا ہوں کہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کو اپنانے سے ہم نے خود پر بربادی کے دروازے کھول دیے، جیسے عسکریت پسندی۔ اس ماڈل نے پورے عالمِ اسلام کو برباد کر دیا۔ خارجی دشمنوں نے ہمیں اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا ہم نے اس ماڈل کے ہاتھوں اٹھایا ہے۔

انفراسٹرکچر کی بنیاد پر ترقی کا ماڈل ان دنوں روبہ عمل ہے۔ گڈ گورننس کو نظر انداز کرتے ہوئے محض اس پر انحصار، معلوم ہے کہ نتیجہ خیز نہیں ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سرمایہ کار کو متاثر کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ جب سرمایہ کار کا پالا اسی کرپٹ نظام سے پڑے گا تو محض موٹروے یا میٹرو کیا اسے سرمایہ کاری پر آمادہ کر سکیں گے؟ بجلی اور گیس کا نظام درست کیے بغیر کیا کوئی صنعت ترقی کر پائے گی؟ کوئی ذی عقل ان سوالات کے جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔ غور کیجیے تو حالات کی یہ خرابی سماج، ریاست اور مذہب کے باب میں ہمارے تصورات کا حاصل ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے رہنما اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے عوام کو خواب دکھاتے ہیں اور وہ انہیں درست بھی مان لیتے ہیں۔

سابق گورنر چودھری سرور نے ایک سوال اٹھایا ہے جو برسوں سے مجھے بھی پریشان رکھتا ہے۔ ان کا سوال یہ ہے کہ ہمارے رہنما اکثر ملک سے باہر جاتے ہیں، ترقی یافتہ ممالک کے نظاموں کو دیکھتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ وہ یہاں ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے؟ ہمارے کئی سیاست دان تو ایسے ہیں جنہوں نے عمر کا بڑا حصہ مغرب میں گزارا، جیسے بے نظیر بھٹو اور عمران خان۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ انگلستان اور یورپ میں تبدیلی کا عمل کیسے شروع ہوا؟ کوئی ایسی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے پاکستان میں علم کی بنیاد پر ترقی کے کسی ماڈل کی کوئی بات کی ہو؟ شریف برادران ترکی سے بہت متاثر ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی غور کیا کہ پل اور سڑکیں بنانے سے پہلے ترکی کسی فکری اور نظری ارتقا سے گزرا؟ مذہبی سیاست دان بھی مغرب کو جانتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے بچے وہیں رہتے ہیں اور وہ خود بھی کثرت سے آتے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی اس اندازِ نظر کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔

پاکستان اور عالمِ اسلام کو اگر آگے بڑھنا ہے تو لازم ہے کہ یہاں بھی علم کی بنیاد پر ترقی کا ماڈل اپنایا جائے۔ یہ ماڈل ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں اور ان میں مقامی حالات کی رعایت بھی رکھی جا سکتی ہے؛ تاہم یہ لازم ہے کہ اس کی اساس علم ہو۔ سیاسی قیادت یہ صلاحیت نہیں رکھتی۔ یہ بدرجہ اولیٰ اہلِ علم و دانش کی ذمہ داری ہے کہ وہ سیاسی قیادت کو اس جانب متوجہ کریں، ترقی کے ماڈل میڈیا کا موضوع بنیں۔ دنیا بھر کے اخبارات میں ادارتی صفحوں پر سماج اور سائنس سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بے مغز سیاست کا غلبہ ہے۔ مقبول ہونے کی ایک دوڑ ہے۔ اب ٹی وی اینکر یا کالم نگار کے بارے میں ڈائریکٹر کرنٹ افیئرز یا ایڈیٹر نہیں، ڈائریکٹر مارکیٹنگ کی رائے معتبر ہے۔ اس اندازِ نظر نے زوال کے دروازے کھول دیے ہیں اور یوں عوامی ذوق کو بلند کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی، الا ماشاءاللہ۔

پاکستان میں ایک صاحبِ علم نے کوشش کی کہ نئے بیانیے کی بحث کو مذہب و ریاست کے مروجہ تصورات کی تشکیلِ نو کی بنیاد پر آگے بڑھایا جائے۔ اس باب میں جواباً جو کچھ لکھا گیا، اسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اہلِ علم کو اس بات کی تفہیم ہی نہیں کہ یہ بحث آج کیوں ضروری ہے۔ اگر انہیں اندازہ ہوتا تو پھر تنقید کا رخ بالکل دوسرا ہوتا۔ پھر وہ بھی اپنا ایک جوابی بیانیہ سامنے لاتے اور یوں سماج کی فکری تربیت کا سامان ہوتا۔ ہمارے ہاں یہ خلطِ مبحث جاری رہے گا جب تک کہ ہم یہ نہیں جان لیتے کہ ہماری ضرورت ترقی کا ایک ایسا ماڈل ہے جس کی اساس علم پر ہو۔

پارلیمنٹ کے فیصلوں سے انکار کیوں؟

کس سے منصفی چاہیں...... انصار عباسی

''اسلام اور ریاست کے عنوان پر ایک جوابی بیانیہ'' پڑھنے کا موقع ملا جس میں صاحب مضمون نے ایک ایسے اسلام کا تصور پیش کیا جو مسلمانوں کے ایک قوم یا امہ کے تصور کی نفی اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹے مسلمانوں کی وکالت کرتا ہے، جہاں ریاست کے اسلامی ہونے کو رد کیا گیا ہو اور مغربی جمہوریت کے تصور کی حمایت کی جاتی ہو، جو خلافت کو کوئی دینی اصطلاح ماننے سے انکاری ہو، جہاں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے مقرر کی گئی سزاؤں میں سے کچھ کو چن لیا جائے اور باقیوں کو رد کر دیا جائے۔ میں ذاتی طور پر ایسے تصور اسلام سے اختلاف کرتا ہوں۔ ان صاحب کو پڑھ کر مجھے ایسا لگا جیسے اُس اسلام کی ترویج کی کوشش کی جارہی ہو جو مغرب کے لیے تو قابل قبول ہو مگر اُس کا اُس اسلام سے تعلق نہ ہو جو ہم تک اللہ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ کے ذریعہ پہنچا اور جس کا عملی نمونہ ہمارے سامنے ریاست مدینہ کی شکل میں اور خلفائے راشدین کے دور خلافت میں نظر آیا۔ شرعی مسائل پر تو ان صاحب کو علمائے کرام ہی جواب دے سکتے ہیں مگر ایک عام مسلمان اور قاری کی حیثیت سے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان صاحب کی ہر دلیل اور ہر نقطہ اسلامی ریاست اور اسلامی نظام کے نفاذ کی نفی کرتا ہو۔ ان کا ماننا ہے کہ جمہوریت اور پارلیمنٹ سے بالاتر کوئی نہیں مگر جہاں اسلام کے نفاذ کی بات آتی ہے تو وہ اپنی اسی تحریر میں جمہوریت اور پارلیمنٹ کے فیصلوں کو ماننے سے انکاری ہیں۔ وہ دینی علوم کے ماہرین کے حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وہ یہ حق یقیناً رکھتے ہیں کہ اپنی تشریحات پیش کریں اور اپنی آراء کا اظہار کریں، مگر ان کے موقف کو لوگوں کے لیے واجب الاطاعت قانون کی حیثیت اسی وقت حاصل ہو گی جب عوام کے منتخب نمائندوں کی اکثریت اسے قبول کرلے گی...... ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اسی (پارلیمنٹ) کا ہوتا ہے اور اسی کا ہونا چاہیے...... علماء ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔ 'امر ھم شوری بینھم' کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے اس سے ہٹ کر حکومت کی جائے گی، وہ ایک ناجائز حکومت ہو گی، خواہ اس کے سربراہ کی پیشانی پر سجدوں کے نشان ہوں یا اسے امیر المومنین کے لقب سے نوازا جائے۔''

چلیں ایک لمحہ کے لیے ان کے تصور اسلام اور جمہوریت پر ہی بات کر لیتے ہیں اور یہ بھی کہ جمہوریت میں پارلیمنٹ ہی کو اصل فیصلوں کا حق ہے جس کے سامنے بقول ان صاحب کے سب کو سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ اگر یہ سچ ہے تو ان سے میرا سوال ہے کہ وہ اپنے اسی مضمون کو پڑھ لیں اور اس بات کا جواب دیں کہ وہ پاکستان کی پارلیمنٹ کے فیصلوں کو ماننے سے کیوں انکاری ہیں۔ اگر پارلیمنٹ ہی کو ہر چیز پر فوقیت ہے تو پھر آپ نے اپنی تحریر میں پاکستان کے آئین کی اسلامی دفعات اور قرارداد مقاصد کے بارے میں یہ کیوں لکھا: ''یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اس کو بھی کسی قرارداد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا'' ایسا کیوں ہے کہ آپ کو پاکستان کی پارلیمنٹ کا یہ فیصلہ بھی قبول نہیں کہ ہمارا ریاستی مذہب اسلام ہے۔ پاکستان کا آئین مدرسوں کے طالب علموں نے بنایا اور نہ ہی مولانا حضرات نے بلکہ پاکستان کے سیاستدانوں نے اس ملک کو متفقہ اسلامی آئین دیا جو اُس خواب کی تعبیر ہے جو شاعر مشرق علامہ اقبال نے دیکھا اور جس کا قائداعظم محمد علی جناح نے وعدہ کیا تھا۔ ان صاحب کو نجانے قرارداد مقاصد سے کیوں اختلاف ہے جو پارلیمنٹ کا فیصلہ ہے اور جو اس بات کا اقرار اور عہد کرتا ہے ''چونکہ اللہ تبارک تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہو گا، وہ ایک مقدس امانت ہے...... جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں پر جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پوری طرح عمل کیا جائے گا، جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی حلقہ ہائے عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جس طرح قرآن پاک اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے، ترتیب دے سکیں، جس میں قرار واقعی انتظام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی سے اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں......'' نجانے اس قرارداد مقاصد میں ایسی کیا چیز ہے جو اسلام کے خلاف ہے یا جو اقلیتوں کی persecution کی اجازت دیتی ہو اور جس پر کسی بھی مسلمان کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ تو پارلیمنٹ کا فیصلہ ہے جس کے سامنے بقول ان صاحب کے سب کو سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ اگر پارلیمنٹ نے ختم نبوت کے انکاریوں بشمول مرزائیوں (جو اپنے آپ کو قادیانی یا احمدی کہتے ہوں) کو غیر مسلم قرار دے دیا تو اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں اعتراض کیسا، جب آپ خود لکھتے ہیں: ''علما ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا''۔ ان کے اسلامی ریاست سے متعلق اعتراضات اسی مضمون میں ان کی اپنی دلیل کے سامنے ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ میری ذاتی رائے میں ریاست، پارلیمنٹ، سیاست، حکومت سب کچھ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات اور ان کی مقرر کی ہوئی حدوں کے تابع ہے۔ مغربی جمہوریت کا تصور اسلام کی ضد ہے جہاں اکثریت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اللہ کے قانون کو بھی رد کر دے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ نے ہمیں جو تصور جمہوریت دیا اس کی یہ خوبصورتی ہے کہ اُسے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے مقرر کردہ حدوں کے اندر محدود کر دیا گیا اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ ہم میں کمی یہ ہے کہ ہم نے اس آئین کے نفاذ کے لیے وہ کوشش نہ کی جو ہم سب کی ذمہ داری

حافظ محمد زبیر-

http://forum.mohaddis.com/threads/%D%8AC%D%88%9D%8A%7D%8A8-%D%8BA%D%8B%2D84%9-%D%8AF%D%8B1-%D%8A%7D%8B%3D%84%9D%8A%7D85%9-%D%8A%7D%88%9D%8B1-%D%8B%1DB8%C%D%8A%7D%8B%3D%8AA-%D%8A%7DB8%C%DA%A9-%D%8AC%D%88%9D%8A%7D%8A%8DB8%C-%D%8A%8DB8%C%D%8A%7D%86%9DB8%C%DB/81.27262%

روزنامہ جنگ ۲۲ جنوری، ۲۰۱۵ء کے ادراتی صفحات پر ملک کے معروف اور نامور اسکالر جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ایک کالم "اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانہ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کالم کے جواب میں اصحاب علم وفضل کی بہت سی تحریریں روزنامہ جنگ اور دیگر اخبارات کے صفحات پر شائع ہوئیں۔ ہماری اس تحریر میں یہ کوشش ہو گی کہ ہم جناب غامدی صاحب کے مجموعی فکر کے تناظر میں ان کے کالم کا ایک تجزیہ پیش کریں۔ جو باتیں درست ہیں، ان سے اتفاق بیان کریں۔ اور جو غلط ہیں، ان کے بارے صحیح موقف پیش کریں:

۱۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں۔

"اس وقت جو صورت حال بعض انتہا پسند تنظیموں نے اپنے اقدامات سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے پوری دنیا میں پیدا کر دی ہے، یہ اسی فکر کا نتیجہ ہے جو ہمارے مذہبی مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، اور جس کی تبلیغ اسلامی تحریکیں اور مذہبی سیاسی جماعتیں شب وروز کرتی ہیں۔"

ہمیں اور نہ ہی اہل مدرسہ کو انتہا پسند تنظیموں کے افکار واعمال سے اتفاق ہے جبکہ غامدی صاحب کا یہ بیان مدارس دینیہ، اسلامی تحریکوں اور مذہبی سیاسی جماعتوں پر ایک الزام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خود غامدی صاحب جو مدرسہ کے نظام ونصاب سے نہیں گزرے، وہ یہ کیسے طے کر سکتے ہیں کہ مدارس اسلامیہ میں وہ سب کچھ پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے جو تحریک طالبان پاکستان یا القاعدہ کے افکار ونظریات ہیں۔ غامدی صاحب کا یہ دعوی اسی طرح کا دعوی ہے جو مدرسے کا ایک فارغ التحصیل پاکستانی یونیورسٹیوں کے بارے یہ کہہ کر کرے کہ یہاں تو الحاد پڑھایا جاتا ہے۔ اگر مدارس دینیہ اور اسلامی تحریکوں میں یہ سب کچھ پڑھایا جاتا ہوتا تو یہ عملی انتہا پسندی آپ کو ایوب، بھٹو اور ضیاء الحق کے ادوار میں بھی نظر آتی۔ پاکستان میں انتہا پسند عناصر ان تحریکوں کی کوکھ سے بر آمد ہوئے جنہیں امریکہ نے پاکستانی آمروں کے تعاون سے روس کے خلاف کھڑا کیا۔ پس عملی انتہا پسندی کے مسئلے کا حل دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی یا اسلامی تحریکوں کے افکار پر پابندی سے کسی صورت حاصل نہ ہو گا کیونکہ یہ اس کی اصل وجہ ہے ہی نہیں۔ اگر ہم ملک پاکستان کو انتہا پسند عناصر کے چنگل سے نکالنے میں سنجیدہ ہیں تو ہمیں وہ وجوہات ختم کرنی ہوں گے جو امر واقعی میں انتہا پسندوں کے کارخانے قائم کیے چلی جار ہی ہیں۔ اور انتہا پسند عناصر کے کارخانے لگنے کی وجوہات میں سب سے اہم وجہ ۱۹۸۰ء سے جنوبی ایشیا میں امریکی پالیسی اور فورسز کی اپنے مفادات کے تحفظ اور فروغ کے لیے موجودگی اور ہمارا بحثیت قوم انہیں خوش آمدید کہنا اور ان کے ہاتھوں کبھی جہاد اور کبھی امن کے نام پر استعمال ہونا ہے۔

۲۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"اس کے بالمقابل اسلام کا صحیح فکر کیا ہے؟ یہ در حقیقت ایک جوابی بیانیہ ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں مذہب کی بنیاد پر فساد پیدا کر دیا جائے تو سیکولرازم کی تبلیغ نہیں، بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانہ ہی صورت حال کی اصلاح کر سکتا ہے۔"

ہمیں غامدی صاحب کی اس بات سے اتفاق ہے کہ جب معاشرے میں اسلام کے نام پر فساد پیدا کر دیا جائے تو اس کا جواب "سیکولرازم کی تبلیغ" نہیں ہے بلکہ فساد برپا کرنے والی مذہبی فکر کا جوابی بیانیہ تیار کرنا ہے۔ پس کسی معاشرے کے لیے یہ صحت مند رویہ نہیں ہے کہ انتہا پسندوں کے فکر یا ان کی کاروائیوں کے رد عمل میں دین اسلام ہی سے اس لیے بیزار ہو جائے کہ وہ اس قسم کی فکر یا کاروائیوں کے لیے اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں بلکہ صحیح رویہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ یہ اسلامی فکر اور دینی عمل نہیں ہے۔ یہ ایک معتدل اور عمدہ بات ہے۔ جزاکم اللہ خیرا۔ لیکن دیگر اصحاب علم وفضل کا کہنا یہ ہے کہ اس پر تو بحث ہو سکتی ہے ناں کہ جناب غامدی صاحب نے جو "جوابی بیانہ" تیار کیا ہے، اسے بھی "سیکولرازم کی تبلیغ" میں ہی رکھا جائے یا وہ امر واقعی میں اس سے ہٹ کر ایک "جوابی بیانیہ" ہے۔

۳۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"لہذا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اس کو بھی کسی قرارداد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔"

غامدی صاحب کی یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ بات ریاست کی تعریف ہی کے خلاف ہے۔ ریاست کے ارکان(pillars) میں علاقہ (territory)، آبادی (population)، حکومت(government) کے علاوہ اقتدار اعلی (sovereignty) بھی شامل ہے جبکہ حکومت کے ارکان میں پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ شامل ہے اور اب بعض ماہرین سیاسات میڈیا کو بھی اس کا ایک رکن قرار دیتے ہیں۔ پس علم سیاسیات (political science) میں ریاست کا کوئی ایسا تصور موجود نہیں ہے کہ جس میں اقتدار اعلی (sovereignty) کو اس سے علیحدہ کیا جا سکے۔ مانا کہ ریاست اور حکومت میں فرق ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا لیکن اقتدار اعلی (sovereignty) کو طے کیے بغیر کوئی ریاست، ریاست کہلانے کی مستحق بھی نہیں ہے۔ اور مسلمانوں کی ایک ریاست میں یہ مقتدر اعلی (sovereign) اور مختار اعلی (supreme authority) کتاب وسنت کے علاوہ کسے بنایا جا سکتا ہے؟

۴۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ اپنی ایک ریاست ہائے متحدہ قائم کر لیں۔ یہ ہم میں سے ہر شخص کا خواب ہو سکتا ہے اور ہم اس کو شرمندہ تعبیر کرنے کی جدوجہد بھی کر سکتے ہیں، لیکن اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم ہے جس کی خلاف ورزی سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"

غامدی صاحب کی یہ بات درست نہیں ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے: «إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الْآخَرَ مِنْهُمَا» کہ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔ ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے خلیفہ کو قتل کرنے کا حکم اس صورت میں ہے جبکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کا خلیفہ ایک ہی ہو جیسا کہ شروع اسلام میں مسلمانوں کی ایک ہی اجتماعیت تھی۔ اب جبکہ مسلمانوں چھوٹی چھوٹی پچاس سے زائد ریاستوں میں تقسیم ہو چکے تو اس حدیث کے مقصد پر عمل کی طرف امت کو راغب کیا جائے گا اور وہ مقصد ہے مسلمانوں کی عالمی اجتماعیت کا قیام۔ پس موجودہ اسلامی ریاستوں کو ایک "اسلامی ریاست ہائے متحدہ" کے قیام کی طرف پیش رفت کرنی چاہیے، یہ ایک دینی حکم ہے۔ اگر یہ دینی حکم نہ ہوتا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی اجتماعیت کو تقسیم کرنے پر قتل کا حکم جاری کیوں فرماتے؟ اسی طرح اگر "ریاست ہائے متحدہ امریکہ" کا وجود میں آنا ان ریاستوں کے لیے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے مفید ہو سکتا ہے تو "اسلامی ریاست ہائے متحدہ" کے مسلم امت کے لیے ان کے اجتماعی پہلووں سے مفید ہونے میں کیا بحث ہو سکتی ہے؟ اور کیا ہمارا دین جو ایک فرد کے ذاتی اور جزوی فائدے کا بھی لحاظ کرتے ہوئے احکام جاری کرتا ہے، اس دین میں اس چیز کا حکم ہی نہ ہو گا کہ جس میں پوری امت کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفادات موجود ہوں۔ اگر ایسا ہے تو یہ تعبیر بہت ہی قابل تعجب ہے۔

۵۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"پہلی صدی ہجری کے بعد ہی، جب مسلمانوں کے جلیل القدر فقہاء ان کے درمیان موجود تھے، ان کی دو سلطنتیں، دولت عباسیہ بغداد اور دولت امویہ اندلس کے نام پر قائم ہو چکی تھیں اور کئی صدیوں تک قائم رہیں، مگر ان میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا۔"

اس بارے ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایک ہے امر واقعی اور ایک امر شرعی۔ امر شرعی تو یہی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں چھوڑا کہ انہیں اپنے بعد ایک ہی خلیفہ مقرر کرنے اور صرف اسی کی بیعت کرنے کا حکم جاری کیا جیسا کہ اوپر روایت گزر چکی۔ امر واقعی یہ ہے کہ مسلمان امت تفرقے میں پڑ کر تقسیم ہو گئی۔ عراق میں بنو عباس، مصر میں فاطمی اور اندلس میں اموی حکومت قائم ہوئی۔ فقہاء نے اس تقسیم کے قائم ہو جانے کے بعد امت کے لیے اپنے علاقوں کے مسلمان حکمرانوں کی اطاعت کو ترجیح دی لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑی ہی تھا کہ وہ امت کے بٹ جانے کو شرعی بھی سمجھتے تھے۔ فقہاء کیسے اس تقسیم پر راضی ہو سکتے تھے جبکہ وہ جانتے تھے کہ یہ مسلمانوں میں باہمی جنگ وجدال اور قتل وغارت گری کی بنیاد ہے۔ اور بنو عباس اور بنو امیہ، عباسی اور فاطمی دشمنی اور قتل وغارت گری کی داستانیں کس پر واضح نہیں ہیں؟ اور مسلمانوں کی اسی باہمی قتل وغارت گری کے نتیجے میں ہی تو بنو امیہ کی حکومت قائم ہوئی ہے اور دیگر حکومتیں بھی اسی طرح سے قائم ہوئی ہیں۔ کیا کہنا کوئی مناسب بات ہو گی کہ اسلام باہمی قتل وغارت گری کے ذریعے مسلم امت کی تقسیم کو جائز قرار دیتا ہے۔ اگر نہیں تو پھر غامدی صاحب کو تاریخ کے صفحات سے یہ واضح کرنا چاہیے تھا کہ بنو عباس اور بنو امیہ اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کی یہ تقسیم کسی باہمی صلح وصفائی کا نتیجہ تھی۔ اندلسی فقیہ اور مجتہد امام ابن حزم رحمہ اللہ اپنی کتاب "مراتب الاجماع" میں لکھتے ہیں: وَاتَّفَقُوا أَنهُ لَا يجوز أَن يكون على الْمُسلمين فِي وَقت وَاحِد فِي جَمِيع الدُّنْيَا

امامان لَامتفقان وَلَا مفترقان وَلَافِي مکانین وَلَافِي مَکَان وَاحِد۔ ترجمہ: اہل علم کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ یہ بالکل بھی جائز نہیں کہ مسلمانوں کے ایک ہی وقت میں پوری دنیا میں دو خلیفہ ہوں، چاہے وہ آپس میں متفق ہوں، چاہے اختلاف کرنے والے ہوں، چاہے دو مختلف علاقوں میں ہوں، چاہے ہی ایک ہی علاقہ میں ہوں۔ اسی طرح امام بیہقی رحمہ اللہ اپنی کتاب "السنن الکبری" میں باقاعدہ "باب لا یصلح إمامان في عصر واحد" ترجمہ: ایک ہی وقت میں دو مسلمان خلفاء کا ہونا جائز نہیں ہے، کے نام سے باب باندھ کر اس کے ذیل میں احادیث نقل کرتے ہیں۔

۶۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔"

خلیفہ سے مراد وہ مسلمان حکمران ہے جو اللہ کے بندوں کے مابین اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے کرے۔ اللہ عزوجل سورۃ ص [آیت ۲۶] میں فرماتے ہیں: يَادَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ ترجمہ: اے داود علیہ السلام! بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے تاکہ آپ لوگوں کے مابین حق کے ساتھ فیصلے فرمائیں۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنی کتاب "مسند احمد" میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں: "فَقَالَ حُذَيْفَةُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَكُونُ النُّبُوَّةُ فِيكُمْ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةٌ عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا عَاضًّا، فَيَكُونُ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً، فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلَى مِنْهَاجِ نُبُوَّةٍ" ثُمَّ سَكَتَ۔ ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے درمیان نبوت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اللہ عزوجل چاہیں گے۔ پھر اللہ تعالی جب چاہیں گے، نبوت کو اٹھالیں گے۔ پھر نبوت کے منہاج پر خلافت قائم ہو گی، پس یہ خلافت علی منہاج النبوۃ جب تک اللہ چاہیں گے، قائم رہے گی۔ پھر اللہ تعالی جب چاہیں گے، اس خلافت علی منہاج النبوۃ کو اٹھالیں گے۔ پھر کاٹ کھانے والی ملوکیت آئے گی اور یہ ملوکیت جب تک اللہ عزوجل چاہیں گے، باقی رہے گی۔ پھر اللہ تعالی جب چاہیں گے، اس کاٹ کھانے والی ملوکیت کو بھی اٹھا لیں گے۔ پھر جبری ملوکیت قائم ہو گی اور اللہ عزوجل جب تک چاہیں گے، یہ جبری ملوکیت قائم رہے گی۔ پھر اللہ تعالی جب چاہیں گے، اس جبری ملوکیت کو اٹھالیں گے۔ اس کے بعد ایک بار پھر خلافت علی منہاج النبوۃ قائم ہو گی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

البتہ اس میں اختلاف ممکن ہے کہ کاٹ کھانے والی اور جبری ملوکیت کے ادوار کون سے ہیں؟ اور ان ادوار کے بعد قائم ہونے والی خلافت علی منہاج النبوۃ کا دور کون سا ہے؟ لیکن اس میں کوئی شک وشبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ خلافت علی منہاج النبوۃ ایک ایسا عادلانہ سیاسی نظام ہے کہ جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کو دے کر گئے اور ظلم وجور کے نظام کے بعد ایک بار پھر اس کے آنے کی خوشخبری دے کر گئے۔

۷۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"یہ بات سب نے کہی اور ہم بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا نظم اجتماعی اگر کسی جگہ قائم ہو جائے تو اس سے خروج ایک بدترین جرم ہے۔"

غامدی صاحب کی یہ بات درست ہے اور اہل سنت والجماعت کی عقیدے کی کتب میں یہی لکھا ہوا ہے اور یہی ائمہ وفقہائے دین کی رائے ہے کہ مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے خلاف خروج جائز نہیں ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ اپنی کتاب "العقیدۃ الطحاویۃ" میں فرماتے ہیں: ولا نری الخروج علی أئمتنا وولاۃ أمورنا وإن جاروا، ولا ندعوا علیھم، ولا ننزع یداً من طاعتھم، ونری طاعتھم من طاعۃ اللہ عز وجل فریضۃ، مالم یأمر وا بمعصیۃ، وندعوا لھم بالصلاح والمعافاۃ. ترجمہ: اور ہم اپنے حکمرانوں اور امراء کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے، چاہے وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں۔ اور نہ ہم ان کے خلاف بددعا کرنے کے قائل ہیں۔ اور نہ ہی ہم ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچتے ہیں، اور ہم ان کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کی طرح فرض سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں۔ اور ہم ان کے لیے اصلاح اور معافی کی دعا کرتے رہتے ہیں۔

۸۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے، جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں کسی جگہ یہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں یا انہیں ایک قوم ہونا چاہیے، بلکہ یہ کہا گیا کہ انما المومنین اخوۃ [مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں]۔ قرآن کی رو سے مسلمانوں کا باہمی رشتہ قومیت کا نہیں، بلکہ اخوت کا ہے۔ وہ دسیوں اقوام، ممالک اور ریاستوں میں تقسیم ہونے کے باوجود ایمان کے رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اس لئے یہ تقاضا تو ان سے کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کے حالات کی خبر رکھیں، ان کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں ان کے کام آئیں، وہ مظلوم ہوں تو ان کی مدد کریں، معاشی اور معاشرتی روابط کے لیے ان کو ترجیح دیں اور ان پر اپنے دروازے کسی حال میں بند نہ کریں، مگر یہ تقاضا نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی قومی ریاستوں اور قومی شناخت سے دست بردار ہو کر لازماً ایک ہی قوم اور ایک ریاست بن جائیں۔"

یہاں غامدی صاحب کی کچھ بات درست ہے کہ مسلمانوں کو قرآن وحدیث میں کہیں بھی ایک قوم نہیں کہا گیا اور مسلمان ایمان کے رشتے کی بنیاد پر ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ "قومیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بنتی"، یہ بات درست ہے۔ قرآن مجید میں ہر نبی نے اپنے مخاطبین کو "یا قوم" کے خطاب سے اپنی قوم قرار دیا حالانکہ مخاطبین نبی کے دین پر نہیں تھے۔ اسی طرح قرآن مجید نے مشرکین مکہ کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قرار دیا ہے۔ پس یہ بات درست ہے کہ قومیں جغرافیائی حدود کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت کرنی ضروری ہے کہ اسلام میں قومیت کی بجائے "امت" اور "ملت" کا تصور ہے۔ اسلام پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم نہیں بلکہ ایک "امت" اور "ملت" قرار دیتا ہے جیسا کہ پوری دنیا کے کافر ایک "امت" یا "ملت" ہیں، چاہے ان کی قومیں مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ [۱۴۳] میں ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ترجمہ: اور ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر شہادت قائم کرو۔ ایک اور جگہ سورۃ آل عمران [۱۱۰] میں

مسمانوں کو "خیر امت" کہا گیا ہے وعلی ہذا القیاس۔ اسی طرح قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ اپنی کتاب "الآثار" میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ سے نقل کرتے ہیں: «الْكُفْرُ كُلُّهُمْ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ» ترجمہ: عالم کفر سب کا سب ایک ہی ملت ہے۔ پس ایمان کے رشتے کی بنیاد پر مسلمانوں میں "اخوت" بھی قائم ہوئی اور "امت وملت" بھی۔ "اسلامی اخوت" کی اصطلاح میں مسلمانوں کی باہمی معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے کا تصور ہے جبکہ "امت مسلمہ" یا" ملت اسلامیہ" کی اصطلاح میں "سیاست شرعیہ" کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ غامدی صاحب نے اپنے حافظے سے سورۃ الحجرات[۱۳] کی جو یہ آیت نقل کی ہے: "إنما المؤمنین إخوۃ" تو اس کا صحیح رسم "إنما المؤمنون إخوۃ" ہے۔

۹۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"دنیا میں جو لوگ مسلمان ہیں، اپنے مسلمان ہونے کا اقرار، بلکہ اس پر اصرار کرتے ہیں، مگر کوئی ایسا عقیدہ یا عمل اختیار کر لیتے ہیں جسے کوئی عالم یا علما یا دوسرے تمام مسلمان صحیح نہیں سمجھتے، ان کے عقیدے یا عمل کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے، اسے ضلالت اور گمراہی کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے حاملین چونکہ قرآن و حدیث ہی سے استدلال کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے انہیں غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ جس پر غامدی صاحب نے کلام کیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہاں ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کی مشق نے امت کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور مولانا ابو لکلام آزاد رحمہ اللہ کے بقول چودہ صدیوں میں ہم نے اتنے مسلمان نہیں بنائے جتنے ایک صدی میں فتووں سے کافر بنا دیے ہیں۔ لیکن تکفیر کے اس فتنے کا حل یہ نہیں ہے کہ یہ بیانیہ تیار کیا جائے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا، چاہے وہ قرآن مجید سے اپنے مذہبی پیشوا کی نبوت ثابت کر لے، یا چاہے الوہیت، چاہے وہ کتاب الٰہی سے ہمہ اوست ثابت کر دکھائے، چاہے ضروریات دین اور ارکان اسلام کا ہی انکار کر دے۔ اس فتنے کا صحیح حل یہی ہے کہ عام مفتیوں اور علماء کو قانوناً اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ تکفیر کے بارے کوئی فتوی جاری نہ کر سکیں۔ اور اسلامی نظریاتی کونسل کی طرح کا کوئی ایسا حکومتی ادارہ ہو کہ جس میں ملک بھر سے مختلف مکاتب فکر کے جید علماء کی نمائندگی ہو، اور جب تک کسی متعین شخص یا گروہ یا جماعت کی تکفیر پر ان نمائندہ علماء کا اتفاق نہ ہو، اور یہ اہل علم ملک کی اعلی عدالت مثلاً سپریم کورٹ کے شریعہ بنچ میں مخالف فریق پر اس کی غلطی واضح نہ کر دیں اور اس بارے اعلی عدالت کا کوئی فیصلہ جاری نہ ہو جائے، اس وقت تک کسی کلمہ گو کی تکفیر قانوناً جرم قرار دی جائے۔ البتہ کسی کے کفر کو کفر اور شرک کو شرک قرار دینا، تو اس کی اجازت ہر صاحب علم کے لیے ہونی چاہیے جیسا کہ غامدی صاحب بھی اس بات سے متفق ہیں۔

۱۰۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"علماء کا حق ہے کہ ان کی غلطی ان پر واضح کریں، انہیں صحیح بات کے قبول کرنے کی دعوت دیں، ان کے عقائد و نظریات میں کوئی چیز شرک ہے تو اسے شرک اور کفر کہیں اور لوگوں کو بھی اس پر متنبہ کریں، مگر ان کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے یا انہیں

مسلمانوں کی جماعت سے الگ کر دینا چاہیے، اس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے، اس لئے کہ یہ حق خدا ہی دے سکتا تھا اور قرآن وحدیث سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اس نے یہ حق کسی کو نہیں دیا ہے۔"

یہاں اصل میں دو چیزیں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ایک ہے اہل علم کا کسی کے بارے فتوی جاری کرنا کہ وہ دین اسلام سے خارج ہو گیا ہے اور ایک ہے کسی شخص کا اللہ کے ہاں کافر قرار پانا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اہل علم کی ایک جماعت کسی شخص کو دنیا میں کافر قرار دے گی تو ضروری نہیں ہے کہ وہ عند اللہ بھی کافر ہو کیونکہ یہ اہل علم کا اجتہاد ہے اور اجتہاد میں خطا کا پہلو بھی ہو سکتا ہے اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اجتماعی اجتہاد میں خطا کا پہلو کم ہو جاتا ہے۔ پس اہل علم اگر کسی پر فتوی لگائیں گے تو وہ دنیا کے اعتبار سے ہو گا۔ اور دنیا میں یہ فتوی "سد الذرائع" کے اصول کے تحت لگایا جائے گا تا کہ دین کی حفاظت ہو۔ اور فتوی کا لفظ بھی "فتوۃ" سے ہے کہ جس کے معنی "نوجوانی" کے ہیں۔ پس جب کسی معاشرے میں عقیدے اور عمل کے رستے ایسا بے گاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جس سے معاشرہ روحانی اور دینی طور اضمحلال کا شکار ہو جائے تو اس وقت "فتوی" کے ذریعے اسے دوبارہ قوت مہیا کی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ فتوی کا ہمارے معاشروں میں ایسا غلط استعمال بہت زیادہ ہے کہ جسے روکنے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کسی شیء کے غلط استعمال کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ نفس امر میں وہ شیء غلط ہے۔

۱۱۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"شرک، کفر اور ارتداد یقیناً سنگین جرائم ہیں، لیکن ان کی سزا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نہیں دے سکتا۔ یہ خدا کا حق ہے۔"

شرک اور کفر کی حد تک تو بات درست ہے کہ اس کی سزا آخرت میں ہی ملے گی جیسا کہ سورۃ البقرۃ [۲۵۶] میں ارشاد باری تعالی ہے: لَاإِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ ترجمہ: دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے۔ پس کسی شخص کو مسلمان بننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن "ارتداد" ایک علیحدہ اصطلاح ہے۔ "ارتداد" سے مراد کسی مسلمان کا دین اسلام سے پھر جانا ہے۔ دین اسلام، ارتداد کو اسلامی ریاست سے ایک بغاوت قرار دیتا ہے لہذا اس کی سزا قتل تجویز کرتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "مسند الشافعی"، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "مسند احمد" اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "صحیح بخاری" میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں کے بارے یہ ارشاد نقل کیا ہے: « مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ » ترجمہ: جو اپنا دین تبدیل کر لے تو اسے قتل کر دو۔ امام مالک رحمہ اللہ نے بھی اس مضمون کی روایت اپنی کتاب "الموطا" میں نقل کی ہے۔ البتہ فقہاء نے یہ نقل کیا ہے کہ جو مسلمان دین اسلام سے پھر جائے گا، پہلے اسے قید کیا جائے گا اور کے اعتراضات اور شکوک وشبہات کو رفع کر کے اس پر حجت قائم کی جائے گی، اس کے بعد اس پر یہ سزا نافذ کی جائے گی۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اسے ریاست نے امان اسی کلمے کی بنیاد پر دی تھی کہ جس کلمے کی اطاعت کو اس نے اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ اسی طرح چونکہ وہ ذمی بھی نہیں ہے کہ اسے جزیہ کی وجہ سے امان حاصل ہوئی ہے لہذا اس کا یہ عمل جب تک اسلامی ریاست کی حدود میں ہو تو اطاعت کے قلادے کو اتار پھینکنے کی وجہ سے سراسر بغاوت پر مبنی عمل ہے۔

۱۲۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"اس میں شبہ نہیں کہ جہاد اسلام کا حکم ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ ان کے پاس طاقت ہو تو وہ ظلم وعدوان کے خلاف جنگ کریں۔ قرآن میں اس کی ہدایت اصلا فتنہ کے استحصال کے لئے کی گئی ہے۔ اس کے معنی کسی شخص کو ظلم وجبر کے ساتھ اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں (persecution) کہا جاتا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ حکم ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں، بلکہ بحثیت جماعت دیا گیا ہے۔"

غامدی صاحب نے یہاں جہاد کا مقصد درست بیان کیا ہے کہ وہ ظلم وعدوان کا خاتمہ ہے۔ پس جہاد کا حکم لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے نہیں بلکہ ظلم وزیادتی کے خاتمے کے لیے ہے۔ لیکن ظلم سے مراد صرف وہی ظلم نہیں ہے کہ جو کسی شخص کو اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے کیا جائے بلکہ ظلم میں ہر قسم کا ظلم شامل ہے۔ خلفائے راشدین کے دور میں جس قدر اقدامی جہاد ہوا ہے مثلاً روم وفارس سے جو جہاد ہوا تو وہاں کون سے مسلمان موجود تھے کہ جن پر ہونے والے ظلم کے جواب میں یہ جہاد جاری کیا گیا۔ اس جہاد کا مقصد اس ظلم کا خاتمہ تھا جو اہل روم اور اہل فارس اپنی اقوام پر کر رہے تھے۔ امام ابن جریر طبری نے اپنی کتاب "تاریخ الرسل والملوک" میں مسلمانوں کے سفیر عامر بن ربعی رضی اللہ عنہ کا ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں جو مکالمہ نقل کیا ہے، اس کا ایک حصہ یہ ہے: اللّٰہُ ابْتَعَثَنَا، وَاللّٰہُ جَاءَ بِنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللّٰہِ، وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سِعَتِهَا، وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ، فَأَرْسَلَنَا بِدِينِهِ إِلَى خَلْقِهِ لِنَدْعُوَهُمْ إِلَيْهِ، فَمَنْ قَبِلَ مِنَّا ذَلِكَ قَبِلْنَا ذَلِكَ مِنْهُ وَرَجَعْنَا عَنْهُ، وَتَرَكْنَاهُ وَأَرْضَهُ يَلِيهَا دُونَنَا، وَمَنْ أَبَى قَاتَلْنَاهُ أَبَدًا، حَتَّى نُفْضِيَ إِلَى مَوْعُودِ اللّٰہِ. ترجمہ: "اللہ نے ہمیں بھیجا ہے، اور اللہ ہمیں تمہارے پاس اس لیے لائے ہیں کہ ہم اللہ کے حکم سے اس کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں، اور انہیں دنیا کی تنگی سے اس کی کشادگی کی طرف لے جائیں، اور انہیں مذاہب عالم کے ظلم وجور سے نکال کر اسلام کے عدل میں داخل کر دیں۔ پس اللہ عزوجل نے اپنا دین دے کر ہمیں اپنی مخلوق کی طرف بھیجا تا کہ ہم انہیں اللہ کی طرف دعوت دیں۔ پس جس نے یہ دعوت قبول کر لی تو ہم بھی اس کے اسلام کو قبول کریں گے اور یہاں سے واپس لوٹ جائیں گے۔ نہ صرف انہیں چھوڑ دیں گے بلکہ ان کی زمین بھی انہی کے پاس رہنے دیں گے۔ اور جس نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو ہم اس سے ہمیشہ کے لیے جنگ کریں گے یہاں تک کہ ہم اللہ کے وعدے کو پالیں"۔ پس اسلام میں جہاد کا مقصود صرف مسلمان پر ظلم کا خاتمہ نہیں بلکہ انسانوں پر سے ظلم کا خاتمہ ہے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ انسانوں پر سے ظلم کا یہ خاتمہ وہی مسلمان کر سکتے ہیں جو خود ظالم نہ ہوں۔

۱۳۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"اسلام جس جہاد کا حکم دیتا ہے، وہ خدا کی راہ میں جنگ ہے، اس لئے اخلاقی حدود سے بے پرواہ ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔"

غامدی صاحب کی یہ بات درست ہے کہ اسلام عین میدان جنگ میں بھی ہمیں اخلاقیات کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنے کا سختی سے حکم جاری کرتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اپنی کتاب "الموطا"، امام شافعی رحمہ اللہ اپنی کتاب "مسند الشافعی"، امام احمد بن حنبل رحمہ

اللہ اپنی کتاب "مسند احمد" اور امام بخاری رحمہ اللہ اپنی کتاب "صحیح بخاری" میں ایسی احادیث لائے ہیں کہ جن میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عین حالت جنگ میں بھی غیر مسلم بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع کر دیا۔

۱۴۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"یہ بالکل قطعی ہے کہ جہاد صرف مقاتلین (combatants) سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کا قانون یہی ہے کہ اگر کوئی زبان سے حملہ کرے گا تو اس کا جواب زبان سے دیا جائے گا، لڑنے والوں کی مالی مدد کرے گا تو اس کو مدد سے روکا جائے گا، لیکن جب تک وہ ہتھیار اٹھا کر لڑنے کے لیے نہیں نکلتا، اس کی جان نہیں لی جا سکتی۔ یہاں تک کہ عین میدان جنگ میں بھی وہ اگر ہتھیار پھینک دے تو اسے قیدی بنایا جائے گا، اس کے بعد اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ بات درست ہے کہ جہاد صرف مقاتلین سے ہی ہو گا لیکن مقاتلین کی جو تعریف غامدی صاحب نے بیان کی ہے، وہ قابل نظر ہے۔ مقاتلین صرف ہتھیار اٹھانے والے نہیں ہوتے بلکہ مقاتلین سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں شریک ہوں، چاہے ہتھیار اٹھا کر، چاہے ہتھیار چلا کر۔ آج کل کی صورت حال میں کسی بھی ملک کی سیکورٹی فورسز، آرمی، نیوی اور فضائیہ میں ہتھیار چلانے والے یا دوبدو لڑنے والے تو کم ہی ہوتے ہیں، باقی ایک بڑی تعداد تو ان کے معاونین کی ہوتی ہے۔

۱۵۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"دور حاضر کے مغربی مفکرین سے صدیوں پہلے قرآن نے اعلان کیا تھا کہ امرھم شوری بینھم [مسلمانوں کا نظم اجتماعی ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہو گا] اس کے صاف معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت ان کے مشورے سے قائم ہو گی۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے گا۔ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں گے۔"

مسلمانوں کی حکومت آپ مشورے سے وجود میں لے آئیں، کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں گے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ مسئلہ کی نوعیت کو دیکھیں گے۔ اگر تو مسئلہ قومی ہے تو قوم سے مشورہ لیا جائے اور اگر علمی ہے تو اہل علم سے مشورہ کیا جائے اور فنی ہے تو اہل فن سے مشورہ لیا جائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر، احد اور خندق کی جنگوں میں عام مشورہ لیا کیونکہ مسئلہ قومی تھا کہ قوم نے ہی لڑنا تھا لہذا اسی سے مشورہ کیا گیا۔

۱۶۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"جدید ریاست میں پارلیمان کا ادارہ اسی مقصد سے قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اسی کا ہے اور اس کا ہونا چاہیے... علماء ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔"

ریاست میں پارلیمان کے ادارے کو "شوریٰ" بنالیں، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ریاست کے نظام میں آخری سند پارلیمان ہے۔ اسلامی ریاست کے نظام میں آخری سند (supreme authority) کتاب وسنت ہیں جو تمام شہریوں کے دنیوی ودینی جملہ حقوق کی ادائیگی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ پارلیمان کو بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ نظام کی جو تعبیر اور صورت وہ پیش کر رہی ہے، وہ ظلم وزیادتی پر مبنی نہیں ہے۔ اور اگر پارلیمان کی کسی تعبیر سے شہریوں کے دنیوی یا دینی حقوق متاثر ہوں گے، تو انہیں اعلیٰ عدلیہ کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اب اعلیٰ عدلیہ اس بارے فیصلہ کرے گی کہ پارلیمان کا وضع کیا گیا نظام کہیں کتاب وسنت کے منافی تو نہیں ہے؟ اگر اعلیٰ عدلیہ یہ فیصلہ کردے کہ پارلیمان کا وضع کردہ نظام کتاب وسنت کے منافی نہیں ہے تو اس کا فیصلہ ہر دو فریقین پر لاگو ہوگا۔

۱۷۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے اس سے ہٹ کر جو حکومت قائم کی جائے گی، وہ ایک ناجائز حکومت ہوگی، خواہ اس کے سربراہ کی پیشانی پر سجدوں کے نشان ہوں یا اسے امیر المومنین کے لقب سے نواز دیا جائے۔"

فریق مخالف کا مشورہ یہ ہے کہ غامدی صاحب کو اپنی رائے میں عاجز ہونا چاہیے۔ اگر وہ بھی فتویٰ کی زبان اور ترش اسلوب میں بات کرنا شروع کردیں گے تو پھر انہیں اپنے ناقدین سے اسی قسم کے اسلوب بیان کا شکوہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ سوسائٹی میں علمی مکالمہ ہونا چاہیے لیکن اس قسم کے الفاظ علمی مکالمہ کی بجائے ردعمل کی نفسیات کو جنم دیتے ہیں۔

۱۸۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کی حکومت اگر کسی جگہ قائم ہو تو اس سے بالعموم نفاذ شریعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یہ تعبیر مغالطہ انگیز ہے، اس لئے کہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ شریعت کے تمام احکام ریاست کی طاقت سے لوگوں پر نافذ کردے حالانکہ قرآن وحدیث میں یہ حق کسی حکومت کے لئے بھی ثابت نہیں ہے...اسلامی شریعت میں دو طرح کے احکام ہیں، ایک جو فرد کو بحیثیت فرد دیئے گئے ہیں، اور دوسرے جو مسلمانوں کے معاشرے کو دیئے گئے ہیں، پہلی قسم کے احکام خدا اور بندے کے درمیان ہے اور وہ اس میں کسی حکومت کے سامنے نہیں بلکہ اپنے پروردگار ہی کے سامنے جواب دہ ہے۔ لہٰذا دنیا کی کوئی حکومت اسے مثال کے طور پر، روزہ رکھنے یا حج عمرہ کے لئے جانے یا ختنہ کرانے یا مونچھیں پست رکھنے اور وہ اگر عورت ہے تو سینہ ڈھانپنے، زیب وزینت کی نمائش نہ کرنے یا اسکارف اوڑھ کر باہر نکلنے کے لئے مجبور نہیں کرسکتی۔ اس طرح کے معاملات میں تعلیم وتربیت اور تلقین ونصیحت سے آگے اس کے کوئی اختیارات نہیں ہیں الا یہ کہ کسی کی حق تلفی یا جان، ومال آبرو کے خلاف زیادتی کا اندیشہ نہ ہو۔ قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کردیا ہے کہ دین کے ایجابی احکام میں سے یہ صرف نماز اور زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی اگر چاہے تو قانون کی طاقت سے کرسکتا ہے...رہے دوسری قسم کے احکام تو وہ درحقیقت دیئے ہی حکومت کو گئے ہیں۔ اس لئے کہ اجتماعی معاملات میں وہی معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے۔ علماء ارباب حل وعقد سے ان پر عمل کا مطالبہ کریں تو یقیناً حق

بجانب ہوں گے اور اپنے منصب کے لحاظ ان کو کرنا بھی چاہیے۔ مگر یہ شریعت پر عمل کی دعوت ہے، نفاذ شریعت کی تعبیر اس کے لئے بھی موزوں قرار نہیں دی جاسکتی۔"

غامدی صاحب نے دینی احکام کی جو دو قسمیں بیان کی ہیں، تو ان کی یہ تقسیم درست ہے۔ پہلی قسم کے بارے ان کا کہنا یہ ہے کہ ان احکامات میں بندہ صرف اپنے پرودگار کو جواب دہ ہے الا یہ کہ کسی کی حق تلفی یا جان ومال یا آبرو کے خلاف زیادتی ہو۔ یہ بات بھی درست ہے لیکن اس میں ایک ضروری اضافے کے بغیر بات نامکمل ہے اور وہ اضافہ یہ ہے کہ اگر اس کے کسی فرد کے عمل سے معاشرے میں فتنہ اور فساد کی راہ کھلے گی تو اسے قانوناً روکا جائے گا۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر حکومت ایک عورت کو سینہ ڈھانپنے یا اسکارف پہننے لیے مجبور نہیں کر سکتی ہے تو کیا حکومت اس کے بے لباس (nude) ہو کر مقامی مقامات پر گھومنے پھرنے کی صورت میں بھی صرف وعظ ونصیحت پر اکتفا کرے گی؟ اور اس صورت میں کسی کی کیا حق تلفی ہوتی ہے یا جان ومال کو نقصان پہنچتا ہے؟ پس صحیح موقف یہ ہے کہ حکومت ہر ایسے کام سے روکے گی اور اسے روکنا بھی چاہیے کہ جو معاشرے میں کسی بھی قسم کے دینی، اخلاقی یا روحانی بگاڑ کا سبب بنے۔

۱۹۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"مسلمان اپنے حکمرانوں کی رعایا نہیں، بلکہ برابر کے شہری ہوں گے اور قانون اور ریاست کی سطح پر ان کے بڑے اور چھوٹے اور شریف اور وضیع کے مابین کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا ان کے جان ومال اور آبرو کو حرمت حاصل ہو گی، یہاں تک کہ حکومت ان کی رضامندی کے بغیر زکوۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس بھی ان پر عائد نہیں کر سکے گی۔"

بہت ہی معتدل اور عمدہ بات ہے کہ اسلامی ریاست میں عام مسلمان اور حکمران برابر کے شہری ہوں گے اور حکومت شہریوں کی مرضی کے بغیر ان پر کسی بھی قسم کا ٹیکس عائد نہیں کر سکے گی۔

۲۰۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:
"نماز جمعہ اور نماز عیدین کا اہتمام حکومت کرے گی۔ یہ نمازیں صرف انہی مقامات پر ادا کی جائیں گی جو حکومت کی طرف سے ان کے لئے مقرر کر دیئے جائیں گے۔ ان کا منبر حکمرانوں کے لئے خاص ہو گا۔ وہ خود ان نمازوں کا خطبہ دیں گے اور ان کی امامت کریں گے یا ان کی طرف سے ان کا کوئی نمائندہ یہ ذمہ داری ادا کرے گا۔ ریاست کی حدود میں کوئی شخص اپنے طور پر ان نمازوں کا اہتمام نہیں کر سکے گا۔"

حکمران ضرور نماز پڑھائیں لیکن بات یہ ہے کہ وہ علمی، اخلاقی اور روحانی طور پر اپنے آپ کو اس کا اہل بھی تو ثابت کریں ناں۔ اگر موجودہ صورت حال میں اس تجویز پر عمل کر لیا جائے تو دین چھوڑ معاشرہ بھی ایک تماشہ بن جائے گا۔ اب اگر جناب زرداری صاحب دارالعلوم کراچی میں عید کی نماز پڑھائیں اور مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب ان کے مقتدی ہوں، جناب نواز شریف صاحب بادشاہی

مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیں اور مولانا مفتی منیب الرحمن صاحب ان کے سامع ہوں اور جناب عمران خان صاحب فیصل مسجد کے امام ہوں اور مولانا فضل الرحمن ان کے مقتدی تو کیا سین پارٹ ہو گا؟ اور پھر جہاں جناب الطاف بھائی کا خطبہ ہو گا اور جناب رحمان ملک کی تلاوت تو مقتدیوں کے پاس کیا نماز قضاء کرنے کے علاوہ بھی کوئی چارہ ہو گا؟ جناب عرض ہے کہ کیوں ایسی بے کار کی تجویزیں پیش کی جائیں کہ جن سے نماز جیسا اہم رکن دین ایک تماشہ بن کر رہ جائے۔ باقی اصلاح ہر طبقے کی ہونی چاہیے، اس سے کس کو انکار ہے؟ لیکن جس طرح سیاست دانوں کی اصلاح کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں ڈاڑھی والے بھرتی کر لیے جائیں، اسی طرح مولویوں کی اصلاح کا یہ کوئی طریقہ کار نہیں ہے کہ منبر و محراب پر سیاست دانوں کو بٹھا دیا جائے۔ "لکل فن رجال"، ہر فن کے اپنے لوگ ہوتے ہیں جو اسے بہتر جانتے ہیں اور بہتر طور چلانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں لہذا رجال کی اصلاح کی خواہش کا اظہار ان کی تربیت کا کوئی نظام قائم تجویز کر کے ہونی چاہیے نہ کہ اکھاڑ پچھاڑ کے رستے۔

۲۱۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"قانون نافذ کرنے والے ادارے اصلا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارے ہوں گے۔ چنانچہ معاشرے میں سے صالح ترین افراد ان اداروں کے لئے کارکنوں کی حیثیت سے منتخب کئے جائیں گے وہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کریں گے اور ان سب چیزوں سے روکیں گے جنہیں انسان ہمیشہ سے برائی سمجھتا رہا ہے۔ تاہم قانون کی طاقت اسی وقت استعمال کریں گے، جب کوئی شخص کسی کی حق تلفی کرے گا یا اس کی جان و مال یا آبرو کے خلاف کسی اقدام کے درپے ہو گا۔"

غامدی صاحب کی یہ تجویز اچھی ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کریں۔ اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ صالح ترین افراد کا انتخاب کیا جائے۔ لیکن قانون کی طاقت استعمال کرنے کی صورتوں میں یہاں بھی ہم وہی اضافہ کریں گے جو پیچھے کر چکے ہیں کہ اُس صورت میں بھی یہ ادارے قانون کی طاقت استعمال کریں گے کہ جس سے معاشرے میں کسی بھی قسم کے فتنہ یا فساد کے پھیل جانے کا اندیشہ ہو۔

۲۲۔ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"قتل اور فساد فی الارض کے سوا موت کی سزا کسی جرم میں بھی نہیں دی جائے گی۔ نیز ریاست کا کوئی مسلمان شہری اگر زنا، چوری، قتل، فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی، خاندانی اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے تو اس پر وہ سزائیں نافذ کی جائیں گی جو اللہ تعالی نے اسلام کی دعوت کو پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔"

غامدی صاحب کی یہ بات درست ہے کہ قتل اور فساد فی الارض میں موت کی سزا دی جائے لیکن اس کے علاوہ بھی بعض جرائم ایسے ہیں کہ جن کی سزا شریعت اسلامیہ میں موت مقرر کی گئی ہے جیسا کہ شادی شدہ مرد یا عورت اگر زنا کا ارتکاب کریں اور ان کا یہ جرم ثابت ہو جائے تو اس کی سزا بھی رجم ہے۔ اسی طرح غامدی صاحب کی طرف سے زنا، چوری، قتل اور قذف کے جرائم میں بیان کردہ

قرآنی سزاوں کے نفاذ کی بات بھی قابل تعریف ہے۔ بس ان جرائم میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور جرم کا اضافہ فرمایااور وہ شراب نوشی ہے۔ شراب نوشی کی صورت میں بھی چالیس یااسی کوڑوں کی سزا جاری کی جائے گی جیسا کہ دونوں طرح کی روایات موجود ہیں۔ اور مجرم کے جرم پر اصرار اور اس جرم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فساد کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے جج ان دونوں میں سے کوئی بھی سزا نافذ کر سکتا ہے۔

اسلام اور ریاست

نوید مسعود ہاشمی

http://www.dailyausaf.com/%D%8A%7D%8B%3D%84%9D%8A%7D85%9-
%D%8A%7D%88%9D%8B1-%D%8B%1DB8%C%D%8A%7D%8B%3D%8AA/

ریاست پاکستان سے مذہب کو نکالنے کے لئے... جو قوتیں پاکستان کے مسلمانوں کے جذبات اور آئین پاکستان کے خلاف بر سرپیکار ہیں ... وہ اب اتنی پوشیدہ بھی نہیں رہیں ... "ریاست" سے مذہب کو نکالنے کا ایجنڈا صرف پاکستان میں بسنے والے سیکولر شدت پسندوں کا ہی نہیں ... بلکہ عالمی صیہونی طاقتوں کا بھی ہے... پروفیسر جاوید غامدی کہ جو اپنے فکری انتشار اور مذہبی مغالطوں کے سبب پاکستان میں انتہائی متنازعہ شخصیت سمجھے جاتے ہیں ... ان کے ذاتی تفردات اور فکری انتشار کا ہی نتیجہ ہے کہ... انہیں نامعلوم خوف کے سبب روپوشی اختیار کرنا پڑی۔

دینی حوالوں سے ایسی متنازعہ شخصیات اہل مغرب اور پاکستانی میڈیا کی ہمیشہ سے پسندیدہ رہی ہیں اسی لئے پروفیسر موصوف پاکستان کے عوام کے درمیان رہنے کی بجائے اکثر چینلز کے ٹاک شوز میں ہی نظر آتے ہیں گزشتہ دنوں جاوید غامدی کا مضمون ایک اخبار نے "اسلام اور ریاست کے عنوان پر جوابی بیانیہ" کے موضوع پر بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ اسلام اور ریاست کے موضوع پر لکھا جانے والا مضمون موصوف کی "شخصیت" کی طرح انتشار وافتراق جہالت اور مغرب کی چاپلوسی کا کھلا اشتہار تھا۔ موصوف پروفیسر کے اس مضمون کے جواب میں برادر محترم انصار عباسی اور علامہ ابتسام الٰہی ظہیر کے مدلل مضامین شائع ہوئے۔ ۲۹ جنوری کے روزنامہ اوصاف میں برادرم محترم مصدق گھمن نے بھی اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ' اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

مگر اس حوالے سے سب سے جامع اور خوبصورت تحریر شیخ الاسلام جسٹس (ر) مفتی محمد تقی عثمانی کی ۲۷ جنوری کو سامنے آئی ... میرا دل چاہتا ہے کہ... میں اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی بجائے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا مضمون من وعن... اپنے کالم کی زینت بنائوں... کیونکہ ان کی تحریر انتشار وافتراق کے ماحول میں اتفاق واتحاد کی دعوت دے رہی ہے' حضرت مفتی تقی عثمانی اسلام اور ریاست کے موضوع پر لکھتے ہیں کہ "غیر منقسم ہندوستان میں قائداعظم کی قیادت میں قیام پاکستان کی جو تحریک چلی اس کی بنیاد مسلم قومیت کے نظریے پر تھی انگریزوں اور ہندوئوں کے مقابلے میں جو تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم قرار دے کر اکھنڈ بھارت کے حق میں تھے قائداعظم نے پورے زوروشور اور دلائل کی روشنی میں یہ نعرہ لگایا کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں'ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم ' مسلمان رہنمائوں'اہل فکر اور علمائے کرام نے اس کی بھرپور تائید کی اور میرے بچپن میں پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ کی جو صدائیں گونجتی تھیں'ان کی دلکش یاد آج بھی کانوں میں محفوظ ہے۔ آخر کار مسلم اکثریت نے قائداعظم کی اس پکار پر لبیک کہا اور ناقابل فراموش قربانیوں کے بعد ہمالیہ کے دامن میں ارض پاک ایک حقیقت بن کر ابھری ' نظریہ پاکستان کی بنیاد تو واضح تھی لیکن ایک چھوٹا سا حلقہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے دستور پاکستان کیلئے وہ قرارداد مقاصد باتفاق منظور کی جس نے ملک کا رخ واضح طور پر متعین کر دیا کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے اور عوام کے منتخب نمائندے اپنے اختیارات قرآن وسنت کی حدود میں رہ کر استعمال کر سکیں گے اور یہ قرارداد ۱۹۵۴' ۱۹۵۶' ۱۹۶۲ اور ۱۹۷۳ کے تمام دستوری مسودوں کا الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ لازمی جز بنی رہی اور آج بھی وہ ہمارے دستور کی وہ دستاویز ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں' چوتھائی صدی تک بنتی ٹوٹتی اسمبلیوں میں بھی اور باہر بھی اس پر کھلے دل سے بحث ومباحثہ بھی ہوا اور بالآخر اس پر پورے ملک کا اتفاق ہو گیا پھر اس کی بنیاد پر دستور کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو یہ دفعہ بھی تمام مسودات دستور میں کسی قابل ذکر اختلاف کے بغیر موجود رہی کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کیخلاف نہیں بنایا جاسکے گا اور موجودہ قوانین کو بھی ان کے سانچے میں ڈھالا جائے گا سن ۱۹۷۳ کا دستور جو آج بھی نافذ ہے اس وقت کے تمام سیاسی اور دینی حلقوں کے اتفاق سے منظور ہوا اور اس پر بفضلہ تعالیٰ آج بھی تمام سیاسی پارٹیاں متفق ہیں'اور اس کا مکمل تحفظ چاہتی ہیں جس کا مظاہرہ اور اس کی مزید تاکید حال ہی میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے تاریخی اتفاق سے دوبارہ ہو گئی ہے' اعلیٰ عدالتوں نے بھی اس دستور کی بنیادی روح کا لازمی حصہ قرار دیا ہے۔

اب کچھ عرصے سے بعض آوازیں پھر گونجنے لگی ہیں کہ ملک کو دہشت گردی سے پاک کرنے کیلئے اسے سیکولر بنانا چاہئے یعنی نصف صدی سے زائد جو فکری سیاسی اور عملی جدوجہد ملک کا صحیح رخ متعین کرنے کیلئے ہوئی ہے اس کی بساط لپیٹ کر پھر الف با سے آغاز کرنا چاہئے ایک ایسے موقع پر جب ملک کے تمام

طبقات دہشت گردی کے عفریت کو مل کر شکست دینے کیلئے کمربستہ ہیں ملک کی بنیاد اس کے قیام کے نظریے اور اس کے متفقہ رخ کو تبدیل کرنے کی کوشش اس فضا میں جو پنڈورا بکس کھول سکتی ہے اور اس سے جو انتشار جنم لے سکتا ہے اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

اسی فضا میں سیکولرازم کے حامی حضرات جو کچھ فرمار ہے ہیں اس کی باز گشت مذہب کے نام پر ایک مذہبی بیانیہ کے عنوان سے سامنے آئی ہے جو روزنامہ جنگ کے ۲۲ جنوری کے شمارے میں اسلام اور ریاست ایک جوابی بیانیہ کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے سیکولرازم کی تبلیغ کے بجائے اپنے افکار کو مذہبی بیانیہ قرار دیا ہے اس بیانیہ کا مقصد انہوں نے شروع ہی میں یہ بیان فرمایا ہے کہ سیکولرازم کی تبلیغ نہیں بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورتحال کی اصلاح کر سکتا ہے اس جوابی بیانیے (Counter narrative) کے جو نکات انہوں نے بیان فرمائے ہیں ان کو بار بار پڑھنے کے باوجود مجھے شاید اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہ ایک عجوبے سے کم نہیں لگتے اور ان کے باہمی تضادات سے مجھے بہت سے تاویلات کے باوجود چھٹکارا نہیں مل سکا اس مضمون میں یوں تو بہت سی باتیں قابل تبصرہ ہیں لیکن ان تمام نکات پر تبصرہ بہت طول چاہتا ہے جس کا یہ مضمون متحمل نہیں لیکن ان میں سے چند متضاد نکات اور ان کے مضمرات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ نکات نہ صرف پاکستان کے قیام کے نظریے ہی کی نفی کرتے ہیں بلکہ ملک کو ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے نظام اجتماعی کی طرف دعوت دیتے ہیں جن کے عملی اطلاق کی کوئی معقول صورت کم از کم مجھ کم فہم کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

سب سے پہلے نکتے میں انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اس کو بھی کسی قرارداد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کیخلاف نہیں بنایا جائے گا اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے آئین میں جو قرارداد مقاصد درج ہے یا اس میں جو پابندی عائد کی گئی ہے کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا یہ قطعی طور پر نہ صرف غیر ضروری بلکہ بے بنیاد خیال پر مبنی ہے قرارداد مقاصد کا بنیادی تصور اللہ تعالی کی حاکمیت اعلی کا اقرار ہے اور اسے غیر ضروری اور بے بنیاد قرار دینے کا نتیجہ ریاست کیلئے اس حاکمیت اعلی کے اقرار کو بے بنیاد قرار دینے کے سوا اور کیا ہے؟

(جاری ہے)

قسط ۲

یہ بیانیہ وہ سیکولرازم کی تبلیغ کے مقابلے میں یا اس کے متبادل کے طور پر پیش کر رہے ہیں لیکن اول تو یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ سیکولرازم کی تبلیغ اور مذہبی بیانیہ کے اس نکتے میں کیا فرق ہوا؟ سیکولرازم بھی یہی کہتا ہے کہ ریاست کا دین سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ دین ایک خالص انفرادی معاملہ ہے وہ بھی یہی کہتا ہے کہ پارلیمان پر کسی دین کی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی لہذا قرارداد مقاصد کی کوئی ضرورت نہیں اور یہی باتیں مضمون اس نکتے میں بھی ارشاد فرمائی گئی ہیں کیا عنوان بدل دینے سے حقیقت میں کوئی فرق آجاتا ہے؟

پھر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد آگے خود وہ نکتہ نمبر ۸ میں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ارشاد امر ھم شوری بینھم کا تقاضا ہے کہ ملک میں ایک پارلیمان قائم ہونی چاہئے اور علمائوں یا ریاست کی عدلیہ پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔ امر ھم شوری بینھم کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملا اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے اس سے ہٹ کر جو حکومت قائم کی جائے گی وہ ایک ناجائز حکومت ہو گی۔

ان دونوں باتوں کے مجموعے سے مطلب یہی نکلتا ہے کہ پارلیمان وجود میں تو قرآنی حکم امر ھم شوری بینھم کے تحت آئیگی مگر اس کے بعد اسے اس بات کا پابند نہیں کیا جاسکتا کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہ بنائے البتہ ملک کے افراد اور ادارے اس بات کے پابند ہیں کہ وہ پارلیمان کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیں۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ریاست کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ پارلیمان کے فیصلوں کو قرآن وسنت کا پابند کیا جاسکتا ہے تو امر ھم شوری بینھم کا قرآنی اصول اس کیلئے کس بنیاد پر لازم ہو گیا؟ اور یہ بات کس بنیاد پر کہی جارہی ہے کہ اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے جبکہ ریاست کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر پارلیمان مغربی ممالک کی طرح ہم جنس شادیوں کا قانون نافذ کر دے تو کیا قرآن کریم کا باہمی مشاورت کا یہ اصول پھر بھی ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہیکہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملا اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جبکہ پارلیمان پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ قرآن وسنت کیخلاف قانون سازی نہ کرے؟

پھر انہوں نے آگے اپنے نکتہ نمبر ۹ میں فرمایا کہ دین کے ایجابی احکام میں سے یہ صرف نماز اور زکوۃ ہے جس کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی اگر چاہے تو قانون کی طاقت سے کر سکتا ہے نظم اجتماعی سے ان کی مراد غالبا حکومت ہی ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نماز کو بزور قانون لازمی قرار دے کر بے

نمازیوں پر سزا جاری کرے؟ اگر یہ واقعی کوئی قرآن کریم کا حکم ہے کہ نماز کا مطالبہ قانون کی طاقت سے کیا جائے جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے تو پھر اگر چاہے کی جو شرط انہوں نے لگائی ہے اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اس قرآنی حکم پر عمل حکومت کی چاہت پر موقوف ہے لہٰذا اگر وہ نہ چاہے تو اس حکم پر عمل نہ کرے۔ اس صورت میں سورۃ احزاب کی اس آیت نمبر۔ کا کیا مطلب ہو گا جس میں فرمایا گیا ہے اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن مرد یا عورت کیلئے یہ گنجائش نہیں ہے کہ انہیں اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔

آگے معاشرتی احکام کے حوالے سے اپنے نکتہ نمبر ۸ میں وہ فرماتے ہیں حکومت ان کی (عوام کی رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس ان پر عائد نہیں کر سکے گی، ان کے شخصی معاملات، یعنی نکاح، طلاق، تقسیم وراثت، لین دین اور اس نوعیت کے دوسرے امور اگر ان میں کوئی نزاع ہو تو اس کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہو گا۔ یہاں پھر کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب ریاست کا کوئی مذہب نہیں اور اس پر قرآن و سنت یا شریعت کے مطابق قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں، تو عدلیہ پر ان احکام میں شریعت ہی کے مطابق فیصلے کرنے کی پابندی کس بنیاد پر ہو گی؟ اور اگر ان معاملات میں پارلیمان شریعت کے بجائے کسی اور قانون کی پابندی کا حکم دے تو اس کے سامنے نکتہ نمبر ۸ کے تحت سر تسلیم کیوں خم نہ کیا جائے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ان کی رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس عائد نہیں کرے گی ظاہر ہے کہ اس میں عوام کی رضامندی سے مراد پارلیمان کی مرضی ہے، لہٰذا مذکورہ جملے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کوئی اور ٹیکس عائد کرنے کے لئے تو پارلیمان کی منظوری درکار ہے، لیکن حکومتی سطح پر عائد کرنے کے لئے پارلیمان کی منظوری کی ضرورت نہیں ہے، اگر یہی مقصود ہے، تو حکومت پارلیمان کے کسی قانون کے بغیر کس بنیاد پر وصول کرے گی اور اس کی اس اتھارٹی کا سرچشمہ کیا ہو گا۔ اگر وہ سرچشمہ قرآن کریم ہے تو کہنا ہو گا کہ قرآن کریم پارلیمان پر بالا دستی رکھتا ہے۔ پھر ریاست کا کوئی مذہب نہ ہونے کا اصول کہاں گیا؟ آگے انہوں نے فرمایا ہے ریاست کا کوئی مسلمان شہری اگر زنا، چوری، قتل، فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی، خاندانی، اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں، تو اس پر وہ سزائیں نافذ کی جائے گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کیلئے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔ یہاں دو سوال پھر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ایسی صورت میں پارلیمان اور حکومت پر لازم ہے کہ وہ ایسے مسلمانوں پر یہ قرآنی سزائیں جاری کرے؟ اگر قرآن کریم کے حکم کے تحت لازم ہے تو جب پارلیمان پر قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں ہے، تو اس پر یہ پابندی کیسے لازم ہو گی کہ وہ قرآنی سزائیں ہی جاری کرے اور ان معاملات میں اپنی طرف سے کوئی اور سزا تجویز نہ کرے، یا ان میں سے کسی جرم مثلاً زنا بالرضا کو جائز قرار نہ دے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ سزائیں قرآن کریم ہی کی بنیاد پر دی جائیں گی تو کیا قرآن کریم میں کوئی ایسی تفریق ہے کہ یہ سزائیں صرف ان مسلمانوں کے لئے ہیں جو شعور کے ساتھ اسلام کی دعوت کو قبول کریں، اور غیر مسلم چوروں، قاتلوں اور فساد فی الارض پھیلانے والوں کو ان سے مستثنیٰ رکھا جائے، جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ سزائیں صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہوں گی؟ انہوں نے اپنے اس بیانیے میں یہ بھی فرمایا ہے کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے قرآن و حدیث میں کسی جگہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں، یا انہیں ایک ہی قوم ہونا چاہئے۔ یہ وہی دو قومی نظریہ کا مسئلہ ہے جس کی بنیاد پر قائد اعظم نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ یہاں مودبانہ گزارش یہ ہے کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں پر لغت یا عرف عام کے مطابق لفظ قوم کا اطلاق درست ہے یا نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ مستقل سیاسی اور اجتماعی وحدت کے لحاظ سے تمام مسلمانوں کو (چاہے وہ کسی رنگ و نسل سے تعلق رکھتے ہوں) غیر مسلموں سے الگ سمجھنا اور اس بنیاد پر ان کے لئے الگ خطہ زمین کا مطالبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ قائد اعظم نے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہوئے جو دو قومی نظریہ پیش کیا تھا اور جس کی بنیاد پر آج ہم ایک الگ ملک کی حیثیت سے بیٹھے ہیں، اس کا مطلب یہی تھا، اس دو قومی نظریہ پر بھی یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے لئے قوم کا لفظ استعمال کرنا لغت اور عرف عام کے اعتبار سے درست نہیں ہے۔

قسط ۳

لیکن ان کا مقصد مستقل سیاسی وحدت تھا جس کی بنیاد پر اپنے اختیار سے کوئی حکومت قائم کی جائے۔ لغوی اعتبار سے تو تمام انبیا علیہم السلام کی مخاطب ان کی قومیں ہی تھیں، لیکن انہوں نے ان کی بنیاد پر کوئی مستقل سیاسی وحدت قائم نہیں کی، اور اگر کوئی ریاست قائم ہوئی تو وہ وطن اور رنگ و نسل کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلام کی بنیاد پر ہوئی، جیسے حضرت موسیٰ، حضرت داؤد و سلیمان علیہم السلام کی حکومتیں اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی حکومت، البتہ اس میں غیر مسلموں کو تمام شہری اور مذہبی حقوق برابر حاصل تھے۔ انہوں نے ایک اور بات اپنے نکتہ نمبر ۲ میں یہ ارشاد فرمائی ہے کہ نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے، اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔ قرآن کریم نے سورۂ بقرہ آیت نمبر ۳۰ میں حضرت آدم علیہ اسلام کے تذکرے میں ارشاد

فرمایاہے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والاہوں۔ اور سورئہ ص آیت نمبر ۲۶ میں حضرت دائود علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایاہے کہ ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایاہے۔ نیز سورئہ نور آیت نمبر ۵۵ میں ارشاد فرمایاہے: تمہیں سے جولوگ ایمان لائے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ان سے اللہ نے وعدہ کیاہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں خلافت عطافرمائے گا، جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو خلافت عطافرمائی تھی، اوران کے لئے اس دین کوضرور اقتدار بخشے گا۔ جسے ان کے لئے پسند کیاہے، اوران کو جو خوف لاحق رہاہے، اس کے بدلے انہیں ضرور امن عطافرمائے گا، وہ میری عبادت کریں، میرے ساتھ کسیکو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث ہیں جن میں اسلامی ریاست کے امیر کو خلیفہ کہاگیاہے۔ اوراس کی حکومت کو خلافت سے تعبیر فرمایاگیاہے۔ قرآن وحدیث کے ان ارشادات کی بناپر اسلامی لٹریچر اس اصطلاح سے بھرا ہوا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے عبقری عالم ابن خلدون رحم اللہ علیہ خلافت کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں : لوگوں کو شرعی طرز فکر کے مطابق چلانا جس سے ان کی آخرت کی مصلحتیں بھی پوری ہوں اور وہ دنیوی مصلحتیں بھی جن کا نتیجہ آخرکار آخرت ہی کی بہتری ہوتا ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون: باب ۳ فصل ۲۵ ص ۱۸۹) قرآن وحدیث کے ان ارشادات اور چودہ سو سال سے اس اصطلاح کے معروف ومشہور بلکہ متواتر ہونے کے باوجود یہ فرمانا کہ خلافت کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے، اس پر تبصرے کیلئے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ مذہبی بیانیہ دہشت گردی کے موجودہ مسائل کی اصلاح کرسکتاہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دستور پاکستان کو تلپٹ کرکے ان متضاد نکات کی بنیاد پر نئے سرے سے دستور بنایاجائے تو دہشت گرد اپنی دہشت گردی سے باز آجائیں گے یاان کا خود بخود قلع قمع ہوجائے گا۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ الحمد للہ ہمارے موجودہ دستور میں چند جزوی باتوں کے سوا کوئی خرابی نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہیکہ اس کے جوہری احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہورہاہے ہمارے دستور میں جو بنیادی حقوق دیئے گئے ہیں وہ لوگوں کو پوری طرح حاصل نہیں ہیں، پالیسی کے جو اصول بنائے گئے ہیں ان پر ایک دن عمل نہیں ہوا صوبوں کو جو حقوق ملنے چاہئیں، وہ نہیں مل رہے عوام کو قدم قدم پر مشکلات، رشوت ستانی اور ظلم وستم کے سامناہے، معیشت کے میدان میں اونچ نیچ حد سے بڑھی ہوئی ہے سرکاری دفتروں سے کام کراناجوئے شیر لانے کے مترادف ہے، عدل و انصاف کے دروازے غریبوں کیلئے تقریبا بند ہیں دستور میں یہ لکھاضرور ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایاجائے گا اور اس کے لئے دستور نے ایک میکنزم بھی تجویز کردیاہے جس پر اگر ٹھیک ٹھیک عمل ہوتو وہ فرقہ واریت کا بھی سدباب کرسکتاہے لیکن اسے برسرکار لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہورہی یہ مجموعی صورتحال عوام میں مایوسی اور چڑچڑاہٹ پیدا کرتی ہے اور شرپسند لوگوں کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملتاہے کہ یہ اصلاحات پرامن ذرائع سے نہیں ہوسکتیں اور حکومتوں کے اس طرز عمل نے اس بات کو مزید ہوا دی ہے کہ جو مطالبہ شریفانہ طور سے وعظ ونصیحت اور مشورے کے طور پر کیاجائے حکومت اسے درخور اعتناہی نہیں سمجھتی اور لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کوئی مطالبہ اسی وقت قابل سماعت ہوسکتاجب وہ ہڑتال اور جلائو گھیرائو کے ساتھ کیاجائے اور اسی کا آخر حل یہ ہے کہ حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھالئے جائیں ملک کے دشمن مسلسل اس فکر کو ہوا دے رہے ہیں، اور اسی بنیاد پر جذباتی نوجوانوں کو گمراہ کیاجارہاہے لہذا مسئلہ دستور میں کسی جوہری تبدیلی کا نہیں، مسئلہ اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کا ہے، اگر اس پر سنجیدگی سے عمل ہونے لگے، عوام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق انصاف میسر ہو اور اسلام کے عادلانہ قوانین ان کی روح کے ساتھ نافذ کئے جائیں، مجرموں کو انصاف کے تمام تقاضوں کے ساتھ عبرت ناک سزائیں دی جائیں تو یہ مسلح تحریکیں اپنی موت آپ مرجائیں گی۔ خدا کیلئے نیا انتشار پھیلانے کے بجائے متحد ہوکر اس جہت میں کام کریں۔

اسلام اور ریاست

تحریر : محمد حنیف جالندھری

ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مہتمم جامعہ خیر المدارس ملتان

قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آیت 208 میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''

اس ارشادِ ربانی کا واضح اور دوٹوک مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم کا اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ مسجد سے لے کر بازار اور میدانِ کارزار تک طریق عبادت سے لے کر انٹرنیٹ اور ہوائی جہاز کے استعمال تک، غسل، وضو، طہارت وغیرہ کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک قرآنِ کریم اور اسلام سے رہنمائی حاصل کریں اور اس کے طے کردہ خطوط کے مطابق زندگی گزاریں۔

''مذہب کی دنیا سیاست و ریاست کی دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہے اور مذہب خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق کا نام ہے'' یہ خیال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی لوگوں کے ذہن میں موجود تھا اور آج بھی بعض لوگ اپنی مصلحتوں کے تحت اس سوچ کو عام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ملک کے معروف قومی روزنامہ ''جنگ'' میں ''اسلام اور ریاست : ایک جوابی بیانیہ'' کے عنوان سے ایک صاحب قلم دانشور نے مفصل مضمون تحریر فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ''یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اس کو بھی کسی قراردادِ مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا'' (روزنامہ ''جنگ'' ۲۲/جنوری ۲۰۱۵ء)

ملک کے ممتاز عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے اس طویل مضمون میں پائے جانے والے تضادات اور اشکالات کا نہایت مدلل، واضح اور اختصار و جامعیت کے ساتھ عالمانہ جواب دیا ہے (ملاحظہ ہو ''جنگ'' ۲۶/جنوری ۲۰۱۵ء)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جواب کے بعد کسی مزید توضیح کی ضرورت یا کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی تاہم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کے فاضلانہ جواب کے بعد یہ طالب علمانہ تحریر محض اس لیے ہے کہ اگر کوئی عام قاری مذکورہ بالا پُر مغز مضمون کو کماحقہ نہیں سمجھ سکا تو وہ حضرت ہی کی بات کو قدرے عام فہم انداز میں سمجھ لے۔

چنانچہ گزارش ہے کہ جس طرح زمین وآسمان کا خالق ایک ہے اسی طرح مذہبی و سیاسی اقتدار کا سرچشمہ بھی اسی کی ذات ہے۔ فیصلہ کرنے اور فرمان روائی کا حق خالق کائنات کے سوا کسی کا نہیں۔ ارشاد ہے ''ان الحکم الا للہ'' (یوسف ۴۰:) حکم نہیں ہے مگر صرف اللہ کے لیے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے ''الا لہ الخلق والامر (الاعراف ۵۴:) خبردار پیدا بھی اللہ نے کیا ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا۔ حتیٰ کہ جو حکمران اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں ان کے بارے میں فرمایا گیا'' اور جو لوگ فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے تو ایسے لوگ ظالم/ فاسق/ کافر ہیں (المائدہ ۴۴:)

مذہب اور ریاست کی وحدت کے سلسلے میں ہمیں سیرت نبوی کا ایک ایسا واقعہ ملتا ہے جو اس بات کی قطعی وضاحت کر دیتا ہے کہ مذہب و سیاست یا اسلام اور ریاست میں کوئی مغایرت نہیں دونوں ایک سکے کے دو رُخ ہیں انہیں الگ الگ دائروں میں تقسیم کرنا دراصل اسلام میں اباحیت وخود پسندی اور بے عملی کا دروازہ کھولنا ہے۔

سیرت ابن ہشامؒ کے مطابق قبیلہ بنو عامر کا سردار بحیرہ بن فراس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تحریک کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور اس کی دُور رس نگاہوں نے تاڑ لیا کہ اسلامی انقلاب کی یہ تحریک جس رخ اور نہج پر چل رہی ہے اس کی وسعت اور کامیابی یقینی ہے اور یہ کامیابی ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہوگی اس سے معاشرے کے تمام پیمانے اور معیار بدل جائیں گے چنانچہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سودے بازی کی کوشش کی اور ''کچھ لو اور کچھ دو'' کے اصول پر بات کرنی چاہی۔ اس نے کہا ''جب آپ کو اپنے مخالفین پر فوقیت اور قبضہ حاصل ہو جائے تو آپ سیاسی اقتدار ہمارے حوالے کر دیں اور مذہبی رہنمائی کے منصب پر خود فائز رہیں'' یہی وہ مقام تھا جہاں اسلام کی جامعیت کو واضح ہونا تھا اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تحریک کا بنیادی مقصد اور حقیقی نصب العین دوٹوک الفاظ اور بے لاگ انداز میں بیان فرمانا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں اگر مذہب کا کوئی محدود تصور ہوتا یا محض روحانی اصلاح پیش نظر ہوتی تو آپؐ بلاتردد فرما دیتے کہ مجھے اقتدار کے بکھیڑوں سے کیا واسطہ؟ یہ دنیا اور اہلِ دنیا کا کام ہے، وہ جانیں اور اُن کا کام جانے۔ لیکن یہاں اس سوچ کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مبہم الفاظ میں فرمایا ''اقتدار کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہ جس کے قبضہ میں چاہے، رکھے گا'' اسی ایک فقرے سے دین کی جامعیت اور اسلامی انقلاب کا مزاج سمجھ میں آجاتا ہے یعنی ایک تو اقتدار و اختیار اور حاکمیت کا حقیقی سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس پر کسی فرد یا خاندان کا موروثی حق نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ نوع انسانی کی دینی و دنیوی اصلاح وفلاح کا مرکز بھی ایک ہی ہے یہ نہیں کہ مذہبی رہنمائی، مصلحین کا کام ہے اور سیاسی اقتدار بادشاہوں کا مقدر ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد نبوت میں مسلمانوں کے لیے محض ایک پیر و مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد، رہنما، حاکم، قاضی، شارع، مُربی اور معلم سب کچھ تھے۔ مسلم سوسائٹی کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتائے سکھائے اور مقرر کیے ہوئے طریقوں کے مطابق ہوتی تھی۔ اس لیے کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز روزے یا مناسک حج کی جو تعلیم دی صرف وہی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہو اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد سمجھ کر نظر انداز کر دی گئی ہوں بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی نماز فوراً مسجدوں میں رائج ہوئی اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے انہی پر مسلمان خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا، لین دین کے جو ضابطے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیے انہی کا بازاروں میں چلن ہو گیا۔ مقدمات کے جو فیصلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے وہی ملک کا قانون قرار پائے۔ لڑائیوں میں جو معاملات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کیے وہی مسلم مملکت کے ضابطے بن گئے اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظامِ حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رائج فرمائیں۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلفاء راشدین نے یہ نہیں کیا کہ خود جہاد و جہانبانی میں مشغول ہو گئے ہوں اور عامۃ الناس کو آزاد چھوڑ دیا ہو کہ ہر شخص خود دین پر عمل کرتا رہے کہ یہ اس کا خدا کے ساتھ انفرادی معاملہ ہے بلکہ خلفاء راشدین نے دین کی روح کے مطابق انفرادی واجتماعی، خانگی ومعاشرتی اور ذاتی وحکومتی سطح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظام کو پوری قوت سے نافذ کیا حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات کی نگرانی بھی فرماتے تھے کہ صبح کی نماز کس کس شخص نے جماعت سے نہیں پڑھی اور کیوں؟

آج کے مصلحت بین اس ارشادِ خداوندی سے صَرفِ نظر کر لیں تو ممکن ہے مگر خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے پیش نظر ہر وقت یہ ارشاد رہتا تھا کہ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے (الحج ۴۱:)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کسی مسلمان فرد یا جماعت کو کسی خطہ میں اقتدار عطا فرمائیں تو اس کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اس اصلاحی نظام کو مملکت کے تمام ذرائع سے عمل میں لائے جو اس نے انسانیت کی فلاح کے لیے پیش کیا ہے۔ گویا محض اس کا قیام، محض قومی سرحدوں کی حفاظت محض عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا اسلامی ریاست کا آخری اور انتہائی مقصد نہیں اس کی امتیازی خصوصیت جو اسے غیر مسلم ریاستوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان بھلائیوں کو فروغ دینے کی کوشش کرے جن سے اسلام انسانیت کو آراستہ کرنا چاہتا ہے اور اُن برائیوں کو مٹانے اور دبانے میں اپنی ساری طاقت خرچ کر دے جن سے اسلام انسانیت کو پاک کرنا چاہتا ہے۔

مذہب اور ریاست کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے والوں کے لیے پوری اُمت کا اجماع معیار ہونا چاہیے۔ پوری اُمت نے دورِ خلافتِ راشدہ کو روشنی کا ایسا مینار قرار دیا ہے جس کی طرف بعد کے تمام ادوار میں فقہاء و محدثین اور عام دیندار مسلمان ہمیشہ دیکھتے رہے اور اسی کو اِسلام کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملہ میں معیار سمجھتے رہے اور اسی سے یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ ''خلافت'' ایک اسلامی اصطلاح ہے اور نظام خلافت کے قیام اور نظام باطل کی جگہ نظامِ حق قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ہر کلمہ گو کی ذمہ داری ہے۔

''مذہبی بیانیہ'' میں اٹھائے گئے دیگر نکات کا مفصل و مدلل جواب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دے چکے ہیں اس لیے ہم نے اپنی گفتگو کو اسلام اور ریاست کے تعلق کی حد تک محدود رکھا ہے، اور یہی اس مضمون کا مرکزی نکتہ ہے۔

ریاست اور حکومت

معروف سکالر علامہ جاوید احمد غامدی نے ''اسلام اور ریاست : ایک جوابی بیانیہ'' کے عنوان کے تحت ایک مؤقر روزنامے میں کالم لکھا۔ میں ان دنوں بیرونِ ملک تھا، معلوم ہوا کہ ایک سے زائد اصحابِ علم نے اُس پر اپنے تحفظات وملاحظات پیش کئے اور دلائل سے اُس کا رَدکیا۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ علامہ غامدی صاحب نے کون سے بیانیے (Narrative) کا جوابی بیانیہ پیش فرمایا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پاکستان کے دستوری میثاق میں اسلام اور قرآن وسنت کے ساتھ جو تمسّک اور اِعتصام (Conviction and Commitment) کا عزم (Resolve) ظاہر کیا گیا ہے، اُسے انہوں نے ریاستِ پاکستان کا بیانیہ قرار دے کر اپنا جوابی بیانیہ پیش کیا ہو۔

اس کے بعد انہوں نے 21 فروری کو ''ریاست اور حکومت'' کے نام سے ایک اور کالم لکھا اور شاید اپنے سابق کالم پر مختلف زاویوں سے وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب پیش کیا ہو۔ تمام تر احترام کے باوجود گزارش ہے کہ یہ کافی حد تک مغالطہ آرائی اور تعبیر کی غلط تشریح (Misinterpretation) پر مبنی ہے، اسے عربی میں : ''تعبیرُ بما لایَرضیٰ بہ القائل'' کہا جاتا ہے، یعنی کسی کے قول کی ایسی تعبیر کرنا جو قائل کی فکر کے خلاف ہو۔ اس کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

علامہ صاحب لکھتے ہیں: ''ایک جزیرہ نمائے عرب کی ریاست جس کی حدود خود خالقِ کائنات نے متعین کر کے اس کو اپنے لئے خاص کرلیا ہے۔ چنانچہ اُسی کے حکم اُس کی دعوت اور عبادت کا عالمی مرکز اُس میں قائم کیا گیا اور ساتویں صدی عیسوی میں آخری رسول کی وساطت سے اعلان کر دیا گیا کہ 'لا یجتمع فیھا دینا' ''اب قیامت تک کوئی غیر مسلم اِس کا شہری نہیں بن سکتا''۔ یہ موقف ہم نے آج تک کسی صاحبِ علم کی نہ تحریر میں پڑھا اور نہ تقریر میں سنا کہ خالق ارض وسما نے پورے روئے زمین میں سے ایک ''خطۂ حجاز'' کو اپنے لئے متعین کرلیا ہو اور باقی کو اپنی عملداری سے آزاد کر دیا ہو۔ قرآن تو جابجا فرماتا ہے :(1) : ''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے، (البقرہ 284:)''۔ اور وہ فرماتا ہے :(2): ''حکم تو بس اللہ ہی کا چلے گا، وہ حق بیان فرماتا ہے اور وہ (حق وباطل کے درمیان) بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے، (الانعام 57:)''۔ (3) : ''سنو! حکم صرف اُسی کا چلے گا اور وہ سب سے جلد حساب لینے والا ہے، (الانعام 62:)''۔ اسی موضوع کو سورۂ یوسف میں ایک سے زائد بار بیان کیا گیا۔ اگر علامہ غامدی صاحب کے بقول اللہ تعالیٰ نے اپنی تشریع عملداری کے لئے سرزمینِ حجاز پر ہی قناعت فرمالی، تو باقی سے محاسبہ کس بات کا ہوگا؟۔

ہماری رائے میں علامہ صاحب قائدِ اعظم کی تقاریر اور بیانات کی بھی اپنے زاویہ نظر سے تشریح فرمارہے ہیں۔ قائدِ اعظم کا بیانیہ اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ انہوں نے قائدِ اعظم کی تقریر کے یہ اقتباسات نقل کئے ہیں: ''اب آپ آزاد ہیں، اس مملکت پاکستان میں آپ آزاد ہیں، آپ مندروں میں جائیں، اپنی مساجد میں جائیں یا کسی اور عبادت گاہ میں۔ آپ کا کسی مذہب، ذات پات یا عقیدے سے تعلق ہو، کاروبار ریاست کا اس سے کوئی واسطہ نہیں...... ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ ابتدا کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک مملکت کے یکساں شہری ہیں۔ انگلستان کے باشندوں کو وقت کے ساتھ ساتھ آنے والے حقائق کا احساس کرنا پڑا اور اُن ذمہ داریوں اور اُس بارگراں سے سبک دوش ہونا پڑا جو اُن کی حکومت نے اُن پر ڈال دیا تھا اور وہ آگ کے اُس مرحلے سے بتدریج گزر گئے۔ آپ بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب وہاں رومن کیتھولک ہیں نہ پروٹسٹنٹ۔ اب جو چیز موجود ہے، وہ یہ کہ ہر فرد ایک شہری ہے اور سب برطانیہ عظمیٰ کے یکساں شہری ہیں۔ سب کے سب ایک ہی مملکت کے شہری ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اِس بات کو ایک نصب العین کے طور پر اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہئے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو ہندو رہے گا، نہ مسلمان مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں، کیوں کہ یہ ذاتی عقائد کا معاملہ ہے، بلکہ سیاسی اعتبار سے اور ایک مملکت کے شہری کی حیثیت سے، (قائدِ اعظم : تقاریر وبیانات 3594 :)''۔

علامہ غامدی صاحب نے تقاریر وبیانات کا عنوان اس لئے قائم کیا ہے کہ متفرقات کو انہوں نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور اس سے وہ نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں کہ ریاست سیکولر ہے، لامذہب ہے اور وہ دین میں فریق نہیں ہے۔ ہماری رائے میں قائدِ اعظم کے افکار کی یہ تعبیر درست نہیں ہے، قائدِ اعظم کے افکارِ عالیہ کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان یعنی اسلامی ریاست میں کسی غیر مسلم کو ترکِ مذہب پر مجبور نہیں کیا جائے گا، نہ ہی اُسے جبراً اسلام میں داخل کیا جائے گا، اُسے اپنے مذہب کے مطابق اپنی عبادت گاہ میں عبادت کی آزادی ہوگی، شہری حقوق کے اعتبار سے اس کو جان ومال اور آبرو کے تحفظ میں مساوی حقوق حاصل ہوں گے، اُسے مسلمانوں کی طرح معاش، کاروبار اور تجارت کی آزادی ہوگی، جو قوانینِ عامّہ (Common Laws) مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں، وہ اُن پر بھی عائد ہوں گے اور ان کے بھی حقوق وفرائض ہوں گے، اسی کو برابر کے شہری یا شہری حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہماری دعا اور تمنا ہے کہ پاکستان میں نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی مکمل عافیت، سلامتی اور امان میں رہیں، یہی ہمارے دستور کا بھی تقاضا ہے۔ اِکّا دُکّا جو ناخوشگوار واقعات وقتاً فوقتاً ہوجاتے ہیں، اِن پر ہمیں شدید افسوس ہے، یہ ہمارے نظام کی کمزوری ہے، اس طرح کے ناخوشگوار واقعات مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا بھارت میں بابری مسجد کو نہیں گرایا گیا، مسلمانوں کے خلاف انسانیت کش فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوتے رہے ہیں، برطانیہ میں مسلمانوں اور مساجد پر حملے نہیں ہوتے، کیا امریکہ میں مساجد کو آگ لگانے کے واقعات نہیں ہوتے، مسلمانوں سے نفرت کے شواہد نہیں ملتے؟۔ لیکن اِن واقعات کی بنا پر کوئی نہیں کہتا کہ امریکہ یا برطانیہ سیکولر ملک نہیں رہے، وہاں اب مذہبی اَشرافیہ کا غلبہ ہوگیا ہے اور اب وہاں جمہوریت نہیں بلکہ Theocracy ہے، ہر جگہ ایسے واقعات کو نظام کی کمزوری یا ناکامی سے تعبیر کیا جاتا ہے، ریاست اور اس کی نظریاتی اَساس کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا، لیکن ہمارے ہاں اس طرح کے ناخوشگوار واقعات کو نظام کی ناکامی قرار دینے کے بجائے فوراً ریاست اور اس کے نظریۂ اسلام کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے، یہی اصل تضاد ہے۔

علامہ غامدی صاحب ایک طرف تو ریاست کو لامذہب قرار دیتے ہیں، مگر پھر لکھتے ہیں: ''اب دوسری ہی باقی ہے، جس کا لازمی نتیجہ اکثریت کی حکومت ہے۔ یہ اکثریت اگر مسلمانوں کی ہے اور اس کی بنیاد پر انہیں کسی ریاست میں اقتدار حاصل ہوجاتا ہے، تو اُن کا جمہوری اور انسانی حق ہے کہ اُن کے دین نے اگر کوئی حکم اجتماعی زندگی سے متعلق دیا ہے تو وہ خود بھی اُس پر عمل پیرا ہوں اور اُس کے ماننے والوں کے تمام معاملات کا فیصلہ بھی اُسی شریعت کے مطابق کریں جو اُنکے پروردگار نے اپنے آخری پیغمبر کی وساطت سے نازل فرمائی ہے۔ قائدِ اعظم جب پاکستان کے حوالے سے اسلام، اسلامی تہذیب اور اسلامی شریعت کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کی مراد بھی یہی ہوتی ہے''۔

ہم یہی کہتے ہیں کہ پاکستان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے، اس لئے انہوں نے قرآن وسنت کی ہدایات کے مطابق اپنے آپ کو اپنے دستوری میثاق میں اسلامی احکام کے نفاذ کا ذمے دار قرار دیا ہے، قرآن وسنت میں بہت سے ایسے اجتماعی احکام ہیں، جو اپنی تنفیذ (Implementation) کے لئے نظمِ اجتماعی اور قوتِ نافذہ جسے ہمارے ہاں اسٹیبلشمنٹ، مُقتدِرہ یا ایگزیکٹو کہا جاتا ہے' کے متقاضی ہیں۔ یہاں ہم جگہ کی قلت کے سبب ان احکام کی تفصیلات بیان نہیں کر رہے، لیکن ہر مسلمان اس سے بخوبی واقف ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں ریاست اور مُملکت کی تعریف یہ کی گئی ہے: ''قوم یا خطۂ ارضی (یعنی جو معینہ سرحدات کے اندر واقع ہو) جو ایک منظم سماج ہو اور ایک حکومت کے تحت ہو''۔ قرآنِ مجید نے اِسے سورۂ یوسف 21:، سورۂ کہف 84:، سورۂ اعراف 10: اور سورۂ حج 41: اور دیگر مقامات پر ''تمکُّن فی الاُرض'' یعنی کسی معینہ خطۂ زمین میں تحکّم اور اقتدار سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی معینہ خطۂ زمین کے بغیر ریاست متصور نہیں ہوسکتی۔ ریاست تو اپنی جگہ ایک وجودِ قانونی (Legal Entity) کا نام ہے، یہ قانونی وجود جامد اور ساکت ہوتا ہے اور یہ اُس ہیئتِ مقتدرہ (Establishment) کے ذریعے بولتا ہے، جو اس پر حاکم ہے، اس کے تحفظ اور مفادات کی ضامن ہے۔ اور اگر وہ ہیئتِ مقتدرہ مسلمانوں کی کل اکثریت یا غالب اکثریت پر مشتمل ہے، تو وہ اسلامی ریاست ہے، مسلمان اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اسلام اور قرآن وسنت کا ترجمان بنے، وہ اللہ کی طرف سے اس کے نفاذ کا مسئول (جوابدہ) اور امین ہے۔ اسی لئے اللہ عزّ وجلّ نے سورۂ مائدہ کی تین آیات میں فرمایا: ''اور جو اللہ کے نازل کردہ احکام پر فیصلے نہ کریں، وہ فاسق ہیں، ظالم ہیں اور کافر ہیں''۔ یہاں صرف اَحکامِ قرآنی پر عمل کرنے کا مطالبہ نہیں ہے کہ کہا جائے ہر شخص انفرادی حیثیت میں اللہ کو جوابدہ ہے، بلکہ یہاں تحکیم اور فیصلہ کرنے کا مطالبہ ہے اور یہ فریضہ صرف نظمِ اجتماعی ہی انجام دے سکتا ہے اور ہمارے نزدیک ریاست کے اسلامی ہونے کے معنی یہی ہیں۔ علامہ غامدی صاحب نے اپنی فکر سے ہمارے اختلاف کو ''تجاہلِ عارفانہ'' یا ''سخن ناشناسی'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اپنے کالم کے اختتام پر وہ ہم جیسے کم فہم لوگوں پر پھبتی کستے ہیں : ع ''سخن شناس نہ ای، دلبرا خطا ایں جاست''۔

مسلم وحدت: مابین فقہائے اسلام و غامدی

حامد کمال الدین ☆

ای میل پر ایک دوست نے روزنامہ جنگ (۲۲ جنوری) کا ایک مضمون بھیجا اور مشورہ دیا کہ اس میں پیش کیے گئے بعض مغالطوں پر کچھ لکھ دیا جائے۔ مضمون کا عنوان ہے ''اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ'' مؤلفہ جاوید احمد غامدی۔(http://goo.gl/0yWPD0) تفصیلی گفتگو تو ظاہر ہے یہاں ممکن نہیں، حتیٰ کہ سب نکات کو زیر بحث لانا بھی ممکن نہیں۔ ان میں سے ہر موضوع ایک تفصیل چاہتا ہے، جس کا یہ مقام نہیں۔ یہاں فی الوقت ''مسلم وحدت'' کے موضوع پر ان کا فقہاء کی بابت ایک دعویٰ ہمارے زیر غور آئے گا۔ لکھتے ہیں:

> ''جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ اپنی ایک ریاست ہائے متحدہ قائم کرلیں۔ یہ ہم میں سے ہر شخص کا خواب ہوسکتا ہے اور ہم اس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی جدوجہد بھی کرسکتے ہیں، لیکن اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم ہے جس کی خلاف ورزی سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہرگز نہیں، نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔ پہلی صدی ہجری کے بعد ہی، جب مسلمانوں کے جلیل القدر فقہاء ان کے درمیان موجود تھے، ان کی دو سلطنتیں، دولت عباسیہ بغداد اور دولت امویہ اندلس کے نام پر قائم ہو چکی تھیں اور کئی صدیوں تک قائم رہیں، مگر ان میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا، اس لیے کہ اس معاملے میں سرے سے کوئی حکم قرآن وحدیث میں موجود ہی نہیں ہے۔''

خط کشیدہ الفاظ فقہائے اسلام کی بابت ایک دعویٰ ہے۔ مضمون نگار پاکستان کے غیر علماء طبقہ میں بے شک ایک بڑی مقبولیت رکھتے ہیں، جس کے بے شمار اسباب ہوں گے۔ لیکن طبقۂ علماء کے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کوئی وجہ ہونی چاہیے کہ ایک فکر کی بابت علمائے

☆ مدیر ماہنامہ ''ایقاظ'' لاہور hamidateeqaz@gmail.com

شریعت کے ہاں غیر علماء طبقہ کی نسبت ایک یکسر مختلف رائے پائی جائے اور وہ اس کا کوئی علمی وزن لگانے پر آمادہ نہ ہوں۔ ایک جیالا ذہن (جو دنیوی علوم میں بے شک بہت پڑھا لکھا ہوگا) اِس ظاہرہ phenomenon کی تفسیر میں وہ بنیاد بھی اختیار کرنے چلا جاتا ہے جو مسیح علیہ السلام نے علمائے بنی اسرائیل کی بابت اختیار فرمائی تھی، اور جس کی ہمسری میں مرزا قادیانی نے علمائے اُمت خاتم المرسلین ﷺ کی بابت ایک مخصوص لہجہ اور ذہن بھی تشکیل دے ڈالا۔ تاہم یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ ہمارے ملک کے تقریباً تمام علمائے اسلام بلاتفریق مکاتب فکر ''المورد'' نام سے سامنے آنے والے ایک نئے ڈسکورس کا علمی وزن لگانے پر آمادہ کیوں نہیں ہیں۔ کم فہمی کا عارضہ لاحق ہے یا کتمانِ حق ہو رہا ہے؟ آخر کچھ تو ہے۔ چند ایک کی بات بھی نہیں ہو رہی، آخر سبھی علماء کو کیا ہوگیا ہے؟ یا مسئلہ خود اِس نئے ڈسکورس کے ساتھ ہے؟ کسی ایک جانب کچھ مسئلہ ضرور ہے، اور کسی ایک کو معاملے پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔

''مسلم وحدت'' کے موضوع پر فقہائے اسلام کے متعلق کیے گئے اِس دعویٰ سے ہی آپ کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ حدیث یا فقہ پر مضمون نگار کے خیالات طبقۂ علماء کے ہاں توجہ نہیں پاتے تو اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے: ''مسلمانوں کی دو سلطنتیں، دولتِ عباسیہ بغداد اور دولتِ امویہ اندلس کے نام پر قائم ہو چکی تھیں اور صدیوں تک قائم رہیں، مگر ان (فقہاء) میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا''۔ کیا واقعتاً فقہاء میں سے ''کسی نے'' اسے اسلامی شریعت کے ''کسی حکم'' کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا؟ معلوم ہوتا ہے ''مسلم وحدت'' کے مسئلہ پر فقہاء کی آراء فاضل مضمون نگار کی نظر سے نہیں گزریں۔ ورنہ زیادہ سے زیادہ وہ اپنی اِس بات کو فقہاء کے ہاں پائی جانے والی ایک ''شاذ رائے'' کہتے، جیسا کہ الماوردی رحمہ اللہ نے اس کے ''شاذ رائے'' ہونے کی باقاعدہ صراحت فرمائی ہے (الماوردی کی عبارت آگے آرہی ہے)۔ البتہ یہ بیان دے ڈالنا کہ فقہاء میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا، کتب فقہ پر مطلع طبقے کے یہاں تعجب سے سنا جائے گا۔ یہاں ہم فقہاء کے کچھ بیانات آپ کے سامنے رکھیں گے۔ اس سے آپ جائزہ لے سکتے ہیں، فقہاء کی بابت فاضل مضمون نگار کی یہ سٹیٹمنٹ فقہاء کے مواقف پر کس درجے کی نظر رکھنے کی غمازی کرتی ہے۔

فقہاء کے اقتباسات دینے سے پہلے البتہ ہم اس مسئلہ پر فقہاء کے ڈسکورس کی کچھ وضاحت کر دینا چاہیں گے، علمائے فقہ ان شاءاللہ ہماری اس بات کی توثیق کریں گے:

"سلطانِ متغلب" کی طرح بہت سی چیزوں کو' کسی خاص زمان ومکان کے لیے' فقہاء نے "امر واقعہ" کے طور پر ضرور قبول کیا ہے: مفسدت کو دفع کرنے کے باب سے' یا کچھ راجح وضروری تر مصالح کو مقدم کرنے کے باب سے۔ یا ایک چیز کے لیے صورت حال کو ناہموار و ناسازگار جاننے کے باب سے (کہ جس میں ایک چیز پر اُمت سے عمل کروانا۔ بوجوہ ممکن نہیں ہوتا۔ البتہ اس کو کرنے کی صورت میں امت کے کچھ فوری وضروری امور ضرور تعطل کا شکار ہو سکتے ہیں یا معاملہ خونریزی کا موجب ہو سکتا ہے)۔ یعنی امت کی سطح پر ایک بات کی "استطاعت" نہ پائی جانا۔ یا ایک بات کا اصولاً مطلوب ہونے کے باوجود ایک "دی ہوئی صورتحال" میں مضرت رساں نظر آنا۔ اِسی چیز کو ضرورت یا اضطرار کے احکام بھی کہا جاتا ہے۔

پس ایک اصولاً درست مسئلہ پر بھی امت میں کوئی فتنہ کھڑا نہ ہونے دینا (کیونکہ فتنہ کو دفع کرنا بہرحال ضروری اور ہر چیز پر مقدّم ہے' خواہ وہ خلافت کا مسئلہ کیوں نہ ہو) فقہاء کے ہاں ایک نہایت قوی اعتبار ضرور ہے۔ چنانچہ کسی معاملہ میں "احکامِ ضرورت" لاگو کرتے ہوئے ایک چیز کو "امر واقعہ" کے طور پر قبول کرنا☆ اور چیز ہے مگر اسے "اسلامی شریعت کی خلاف ورزی" قرار نہ دینا بالکل اور چیز۔ جیسا کہ ہم نے مثال دی' "سلطانِ متغلب" کو "امر واقعہ" کے طور پر تو فقہاء بے شک قبول کرلیں گے' یہاں تک کہ اُمت کے مصالح (مانند جہاد' اقامت عدل' نفاذِ شریعت اور امن واستقرار) کو معطل نہ ٹھہرانے کے باب سے سلطانِ متغلب کے احکامات پر عمل درآمد اور اس کے ساتھ مل کر جہاد کو بھی لازم ٹھہرا دیں گے' فتنہ وخونریزی کا دروازہ بند رکھنے کے باب سے اس کے خلاف خروج کو بھی منع ٹھہرا دیں گے (فقہاء کی بڑی تعداد کا موقف)...... لیکن "سلطانِ متغلب" کو شرعاً جائز و ناقابلِ اعتراض ٹھہرا دیں' یہ ممکن

☆ جس طرح ہمارے فاضل مضمون نگار "قراردادِ مقاصد" والے "اسلامی" و "مذہبی" پاکستان کو احکامِ ضرورت کے باب سے قبول کریں گے جبکہ اصولاً اس کو مسترد کر دیں گے! یا جیسے اگر یہ سعودی عرب یا کویت وغیرہ میں ہوتے تو "بادشاہت" کو امر واقعہ کے طور پر قبول کرتے' اس کے احکامات پر عمل درآمد اور اس کے خلاف عدم بغاوت ہی کا فتویٰ دیتے۔ بادشاہ کے خلاف خروج کرنے والے کو باغی کہتے۔ لیکن اس کا مطلب ظاہر ہے یہ نہ ہوتا کہ وہ "بادشاہت" یا "شخصی استبداد" کو شریعت کی خلاف ورزی نہیں مانتے۔ غرض یہ ہمارے ساتھ اتفاق کریں گے کہ ایک چیز کو امر واقعہ کے طور پر قبول کرنا' حتیٰ کہ اس کو کچھ شرعی احکام بھی دے دینا اسے اصولاً "شریعت کی خلاف ورزی" قرار دینے کے ساتھ متعارض نہیں۔

نہیں۔ جس کا خود بخود مطلب ہے' قدرت واستطاعت ہونے کی صورت میں سلطانِ متغلب کو رد کرنا ہی فقہاء کے نزدیک شریعت کا تقاضا ہوگا۔ ایسا ہی معاملہ "دولت اسلامی کے انقسام" کا ہے۔ اسلامی قلمرو کے ٹکڑے ہونا فقہاء کے ہاں اصولاً احکامِ شریعت کی خلاف ورزی ہی ہے اگرچہ عدم استطاعت یا دفعِ فتنہ کے باب سے اِس صورتحال کو بدلنے پر عامۃ الناس کو اکسانا کسی وقت ممنوع کیوں نہ ٹھہرا دیا جائے۔ جیسا کہ ہمارے اِس دور کے علماء کی اکثریت بھی متقدمین کی راہ پر چلتے ہوئے "خلافت" یا "دین کی پابند حکومت" لانے کی خاطر شورش اور بدامنی برپا کرنے کو ممنوع ہی ٹھہراتی ہے' جو کہ حق ہے۔

تو پھر آیئے دیکھتے ہیں' مؤلفین فقہاء "اسلامی قلمرو کے انقسام پر" اپنے قبیلے کے موافق کیونکر نقل کرتے ہیں۔ واضح رہے' یہاں ہم ان فقہاء کے اقوال دیں گے جو اس "انقسامِ خلافت" ہی کے ادوار میں پائے گئے۔ یعنی یہ معاملہ بطورِ واقعہ بھی ان کی نظر میں ہی تھا اور وہ کسی سہانے دور میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں نہیں کر رہے تھے۔ دیکھئے یہ فقہاء اِس موضوع پر کیا کہتے ہیں:

سیاستِ شرعیہ پر قلم اٹھانے والا ایک بڑا نام الماوردی رحمہ اللہ (چوتھی صدی ہجری کے فقیہہ' اپنے وقت کے قاضی القضاۃ) لکھتے ہیں:

وذهب الجمهور الى ان اقامة امامين فى عصر واحد لا يجوز شرعا لما روى عن النبى ﷺ انه قال: اذا بويع اميران فاقتلوا احدهما [۱]

"جمہور کا مذہب رہا ہے: ایک زمانے میں دو اماموں کا مقرر ہونا شرعاً جائز نہیں ہے' کیونکہ نبی ﷺ سے مروی ہے: جب دو امیروں کی بیعت ہو جائے تو ان میں سے ایک کو قتل کر دو۔"

ماوردی کی مندرجہ بالا نقل غور فرمالیجئے: جمہور کا مذہب۔

ماوردی رحمہ اللہ اُمت میں "ایک وقت میں مسلمانوں کے دو ملک یا دو امیر" ہونے کے جواز کو ایک شاذ قول قرار دیتے' اور امت میں ایک ہی امارت کو ضروری ٹھہراتے ہوئے:

وإذا عقدت الإمامة لإمامين فى بلدين لم تنعقد إمامتهما' لأنه لا يجوز أن يكون للأمة إمامان فى وقت واحد وإن شذ قوم فجوزوه[۲]

"اگر دو مختلف ملکوں میں دو امیروں کو امامت سونپی جائے تو ان دونوں کی امامت منعقد نہ ہوگی۔ کیونکہ ایک وقت میں امت کے دو امام جائز نہیں' اگرچہ بعض لوگوں نے شذوذ کی راہ چلتے ہوئے اسے جائز کہا ہے۔"

یہ جمہور فقہاء‘ جن کا الماوردی و دیگر مؤلفین کے بیان میں ذکر ہوا‘ اس قدر زیادہ ہیں کہ نووی ؒ (ساتویں صدی ہجری) اس کو ’’علماء کا متفقہ قول‘‘ ہی قرار دینے تک چلے جاتے ہیں۔ تاہم نوویؒ کی تقریر دینے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صحیحین کی وہ روایت نقل کر دی جائے جس کے تحت (شرح مسلم میں) نوویؒ فقہاء کا یہ اتفاق نقل کرتے ہیں۔ کیونکہ خود یہ حدیث بھی اس باب میں معانی کا ایک سمندر ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ، وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَتَكُوْنُ خُلَفَاءُ وَتَكْثُرُ)) قَالُوْا: فَمَا تَاْمُرُنَا؟ قَالَ :((فُوا بِبَيْعَةِ الْاَوَّلِ فَالْاَوَّلِ، وَاَعْطُوْهُمْ حَقَّهُمْ، فَاِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ)) (۳)

’’بنی اسرائیل کے معاملاتِ سیاست انبیاء چلاتے رہے‘ جیسے ہی کوئی نبی دنیا سے جاتا اس کا جانشین نبی ہوتا۔ اب یقیناً میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ ہاں خلفاء ہوں گے اور بہت زیادہ ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کی: تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: جس کی بیعت پہلے ہو جائے اُسی کی بیعت نبھاتے چلے جانا۔ تم ان کو ان کا حق دیتے رہنا‘ کیونکہ اللہ نے جو کچھ ان کی رعیت میں دیا اُس کی بابت اُن سے وہ خود سوال کرنے والا ہے۔‘‘

حدیث بالا کی شرح میں نووی ؒ فرماتے ہیں:

وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى أَنَّهُ لَا يَجُوزُ أَنْ يُعْقَدَ لِخَلِيفَتَيْنِ فِي عَصْرٍ وَاحِدٍ سَوَاءٌ اتَّسَعَتْ دَارُ الْإِسْلَامِ أَمْ لَا، وَقَالَ إِمَامُ الْحَرَمَيْنِ فِي كِتَابِهِ الْإِرْشَادِ قَالَ أصحابنا لا يجوز عقدها لشخصين قَالَ وَعِنْدِي أَنَّهُ لَا يَجُوزُ عَقْدُهَا لِاثْنَيْنِ فِي صُقْعٍ وَاحِدٍ وَهَذَا مُجْمَعٌ عَلَيْهِ ، قَالَ فَإِنْ بَعُدَ مَا بَيْنَ الْإِمَامَيْنِ وَتَخَلَّلَتْ بَيْنَهُمَا شُسُوعٌ فَلِلِاحْتِمَالِ فِيهِ مَجَالٌ ، قَالَ وَهُوَ خَارِجٌ مِنَ الْقَوَاطِعِ ، وَحَكَى الْمَازِرِيُّ هَذَا الْقَوْلَ عَنْ بَعْضِ الْمُتَأَخِّرِينَ مِنْ أَهْلِ الْأَصْلِ وَأَرَادَ بِهِ إِمَامَ الْحَرَمَيْنِ وَهُوَ قَوْلٌ فَاسِدٌ مُخَالِفٌ لِمَا عَلَيْهِ السَّلَفُ وَالْخَلَفُ وَلِظَوَاهِرِ إِطْلَاقِ الْأَحَادِيثِ ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ (٤)

’’علماء کا اتفاق ہے‘ ایک زمانے میں دو خلیفے نہیں ہو سکتے خواہ دار الاسلام کا رقبہ بہت وسیع ہو یا نہ ہو۔ امام الحرمین (جوینی) نے اپنی کتاب الارشاد میں ذکر کیا کہ ہمارے (شافعیہ کے) اصحاب کا یہی مذہب ہے کہ امارت (بیک وقت) دو شخصوں کے لیے

منعقد نہیں ہو سکتی۔ لیکن جوینی کا اپنا کہنا ہے کہ میرے نزدیک کسی ایک خطے میں دو آدمیوں کی امارت تو منعقد نہیں ہو سکتی اور اس پر تو اجماع ہے‘ البتہ اگر دو امیروں کے مابین مسافت بہت زیادہ ہو اور ان دونوں کے بیچ میں بہت سے علاقے پڑتے ہوں تو یہاں احتمالات کی گنجائش ہے اور (اس صورت میں) یہ قطعیات میں نہیں آتا۔ مازری نے یہی قول کسی متاخر سے نقل کیا ہے۔ اس متاخر سے مازری کی مراد امام الحرمین (جوینی) ہی ہیں۔ مگر یہ قول فاسد ہے‘ سلف تا خلف جو مذہب رہا ہے یہ اس سے متصادم ہے۔ نیز یہ احادیث کے ظواہر سے متصادم ہے۔ واللہ اعلم۔‘‘

ابن حزم ؒ کا دعوائے اجماع: جس کے ’’اجماع‘‘ ہونے سے آپ بے شک اتفاق نہ کریں‘ مگر اس سے آپ کو یہ ضرور اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قول پر فقہاء کی کتنی بڑی تعداد ہے‘ جس کے متعلق ہمارے فاضل مضمون نگار کا خیال ہے ’’فقہاء میں سے کسی نے اسے شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی ہی قرار نہیں دیا‘‘۔ ابن حزم:

واتفقوا أنه لا يجوز أن يكون على المسلمين في وقت واحد في جميع الدنيا إمامان‘ لا متفقان ولا مفترقان‘ ولا في مكانين ولا في مكان واحد (٥)

’’نیز اس پر اجماع ہوا ہے کہ: مسلمانوں پر ایک وقت میں پوری دنیا کے اندر دو امام ہونا ناجائز ہے‘ خواہ وہ امام اکٹھے ہوں یا متفرق۔ یہ نہ دو الگ الگ جگہوں میں جائز ہے اور نہ ایک جگہ میں۔‘‘

ابن حزمؒ (پانچویں صدی ہجری) کے مندرجہ بالا بیان پر ابن تیمیہ ؒ (ساتویں صدی ہجری) اتنا سا استدراک کرتے ہیں کہ اس سے اختلاف کرنے والے بعض اہلِ کلام ضرور ہیں۔ نیز (احکامِ ضرورت کے تحت) ہر دو مملکت کے احکامات پر عملدر آمد ہوگا۔ البتہ جہاں تک ہر دو فرماں روا کی حکومت کو ’’جائز‘‘ ماننے کا تعلق ہے تو اس کو غلط کہنے پر امت کا اتفاق ہے:

النزاع في ذلك معروف بين المتكلمين في هذه المسألة كأهل الكلام والنظر‘ فمذهب الكرامية وغيرهم جواز ذلك، وأن عليًا كان إمامًا ومعاوية كان إمامًا‘ وأما أئمة الفقهاء فمذهبهم أن كلاً منهم ينفذ حكمه في أهل ولايته كما ينفذ حكم الإمام الواحد ، وأما جواز العقد لهما فهذا لا يفعل مع اتفاق الأمة (٦)

’’اس پر اہلِ کلام و فلسفہ ایسے متکلمین اختلاف معروف ہے۔ کرامیہ وغیرہ فرقے اس

کے جواز کے قائل ہیں' اور یہ کہ علیؓ بھی امام تھے اور معاویہؓ بھی امام تھے۔ البتہ جہاں تک ائمہ فقہاء (اہلِ سُنّت) کا تعلق ہے تو ان کا مذہب ہے کہ ہر دو امیر کا حکم اپنی اپنی قلمرو میں اسی طرح نافذ ہوگا جس طرح ایک امام کا ہوتا ہے۔ ہاں جہاں تک اس کو جائز کہنے کا تعلق ہے تو امت کا اتفاق ہے کہ دونوں کو بیک وقت امارت سونپنا صحیح نہیں۔''

روئے زمین پر مسلمانوں کا ایک امیر ضروری قرار دینے پر مذاہبِ اربعہ

ساداتِ حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم:

مَا افْتَرَقَ فِيهِ الْإِمَامَةُ الْعُظْمَى وَالْقَضَاءُ يُشْتَرَطُ فِي الْإِمَامِ أَنْ يَكُونَ قُرَشِيًّا بِخِلَافِ الْقَاضِي' وَلَا يَجُوزُ تَعَدُّدُهُ فِي عَصْرٍ وَاحِدٍ وَجَازَ تَعَدُّدُ الْقَاضِي' وَلَوْ فِي مِصْرٍ وَاحِدٍ (۷)

''کن چیزوں میں امامت عظمیٰ قضاء سے مختلف ہے: امام کا قریش سے ہونا شرط ہے برخلاف قاضی کے۔ نیز امام ایک زمانے میں متعدد ہونا جائز نہیں جبکہ قاضی متعدد ہونا جائز ہے' خواہ ایک ہی شہر میں کئی قاضی ہوں۔''

فَإِذَا اجْتَمَعَ عَدَدٌ مِنَ الْمَوْصُوفِينَ فَالْإِمَامُ مَنِ انْعَقَدَ لَهُ الْبَيْعَةُ مِنْ أَكْثَرِ الْخَلْقِ' وَالْمُخَالِفُ لِأَكْثَرِ الْخَلْقِ بَاغٍ يَجِبُ رَدُّهُ إِلَى انْقِيَادِ الْمُحِقِّ (۸)

''اگر امام بننے کی صفات کے متعدد حاملین بیک وقت سامنے آئیں تو ان میں امام وہ ہوگا جسے اکثر مخلوق نے بیعت دی ہو۔ اکثر مخلوق کی بیعت (سے بننے والے امام) کے مقابلے پر امام بننے والا باغی ہوگا اور اس کو حق کی تابعداری پر واپس لانا واجب ہوگا۔''

ساداتِ مالکیہ رحمۃ اللہ علیہم:

(تَنْبِيهٌ) أَشْعَرَ مَا ذَكَرَهُ الْمُصَنِّفُ مِنْ جَوَازِ تَعَدُّدِ الْقَاضِي بِمَنْعِ تَعَدُّدِ الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ وَهُوَ كَذَلِكَ وَلَوْ تَبَاعَدَتِ الْأَقْطَارُ جِدًّا لِإِمْكَانِ النِّيَابَةِ وَقِيلَ بِالْجَوَازِ إِذَا كَانَ لَا يُمْكِنُ النِّيَابَةُ لِتَبَاعُدِ الْأَقْطَارِ (۹)

''نوٹ: مصنف نے متن میں جو بیان کیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ: قاضی کا متعدد ہونا جائز اور امام کا متعدد ہونا منع ہے۔ اور ہے بھی ایسا' اگر چہ خطے بہت دور کیوں نہ ہوں'

کیونکہ (دور کے خطے میں) امام کی نیابت ہو سکتی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اُس صورت میں جائز ہے جب خطوں کے مابین اتنا بعد ہو کہ نیابت ممکن ہی نہ رہے۔''

ساداتِ شافعیہ رحمۃ اللہ علیہم:

(وَلَا يَجُوزُ عَقْدُهَا لِإِمَامَيْنِ) فَأَكْثَرَ' وَلَوْ بِأَقَالِيمَ (وَلَوْ تَبَاعَدَتْ الْأَقَالِيمُ) لِمَا فِي ذَلِكَ مِنَ اخْتِلَافِ الرَّأْيِ' وَتَفَرُّقِ الشَّمْلِ (فَإِنْ عُقِدَتَا) أَيْ الْإِمَامَتَانِ لِاثْنَيْنِ (مَعًا بَطَلَتَا أَوْ مُرَتَّبًا انْعَقَدَتْ لِلسَّابِقِ) كَمَا فِي النِّكَاحِ عَلَى امْرَأَةٍ (وَيُعَزَّرُ الْآخَرُونَ) أَيْ الثَّانِي وَمُبَايِعُوهُ (إِنْ عَلِمُوا) بَيْعَةَ السَّابِقِ لِارْتِكَابِهِمْ مُحَرَّمًا. (۱۰)

''دو یا دو سے زیادہ اماموں کے لیے امارت کا انعقاد جائز نہیں' چاہے خطے الگ الگ کیوں نہ ہوں' چاہے خطے دور دور کیوں نہ ہوں' کیونکہ اس میں آراء کے بٹ جانے اور شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ واضح ہے۔ اگر دو امامتیں دو اشخاص کے لیے ایک ہی وقت میں منعقد کر دی گئی ہوں تو وہ دونوں باطل ہوں گی۔ اور اگر آگے پیچھے منعقد ہوئیں تو جس کی پہلے ہوئی اس کی منعقد ہو جائے گی۔ جس طرح کہ (مختلف ولیوں کے ہاتھوں) عورت کے ایک سے زیادہ نکاح کا معاملہ ہوتا ہے۔ جبکہ بعد والے اور اس کی بیعت کرنے والوں کو سزا دی جائے گی بشرطیکہ ان کو پہلے والے کی بیعت کا علم ہو گیا ہو' اس لیے کہ ایک حرام کے مرتکب ہوئے۔''

ساداتِ حنابلہ رحمۃ اللہ علیہم:

(ويتجه) أنه (لا يجوز تعدد الإمام) لما قد يترتب عليه من التنافر المفضي إلى التنازع والشقاق ووقوع الاختلاف في بعض الأطراف' وهو مناف لاستقامة الحال' يؤيد هذا قولهم: وإن تنازع في الإمامة كفؤان أقرع بينهما إذ لو جاز التعدد لما احتيج إلى القرعة. (۱۱)

''اس کی توجیہہ یوں ہے کہ: متعدد امام ہونا جائز نہیں۔ اس لیے کہ اس سے باہمی منافرت پیدا ہوتی ہے جو کہ باہمی نزاع اور جدائی کا باعث بننے والی ہے اور (امت کے) اطراف کے مابین اختلاف لے آنے کا موجب۔ جبکہ یہ چیز راست روی کے منافی ہے۔ اس کی تائید فقہاء کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ اگر امامت کے اہل دو اشخاص میں تنازع ہو جائے تو ان دونوں کے مابین قرعہ ڈالا جائے گا۔ ظاہر ہے اگر تعدد جائز ہوتا تو قرعہ کی ضرورت نہ ہوتی۔''

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر:

والسنة أن يكون للمسلمين إمام واحد والباقون نوابه فإذا فرض أن الأمة خرجت عن ذلك لمعصية من بعضها أو عجز من الباقين أو غير ذلك فكان لها عدة أئمة لكان يجب على كل إمام أن يقيم الحدود ويستوفي الحقوق (١٢)

”سُنّت (دستور) یہی ہے کہ جملہ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور باقی اس کے نائب ہوں۔ ہاں اگر کسی وقت امت اس دستور سے ہٹ جائے خواہ اِس وجہ سے کہ امت کے کچھ لوگ معصیت کی راہ چل پڑے ہیں اور باقی لوگ بے بس ہو گئے ہیں یا کسی اور وجہ سے امت کے ہاں متعدد امام ہو گئے ہیں‘ تو یہاں ہر امام پر واجب ہوگا کہ وہ حدود قائم کرے اور حقوق کو یقینی بنائے۔“

فقہاء کے درج بالا اقوال میں آپ دیکھتے ہیں: احکامِ ضرورت بھی ایک ساتھ ذکر ہو گئے اور احکامِ اصلی بھی۔ یہی توازن شاید آج ہمارے لوگوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بدترین سے بدترین حالات میں بھی احکامِ اصلی پر ہی مصر رہنا ایک یوٹوپیا (غیر حقیقت پسندانہ) روش کو جنم دیتا ہے‘ جو کہ لامحالہ انتہا پسندی کی صورت دھارتا ہے۔ اسی کو ہم ”غلو“ یا ”افراط“ کہتے ہیں۔ غیر علماء طبقہ میں یہ روش بھی اِس وقت عروج پر ہے۔ دوسری طرف احکامِ اصلی کو سرے سے گول کر جانا ”جفا“ کا راستہ ہے جسے ہم ”تفریط“ کہتے ہیں اور جس پر ہمیں صاحب مضمون دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ اُمت بیچاری ان دو انتہاؤں کے بیچ کٹی پھٹی جاتی ہے۔ ہر انتہا پسند طبقہ‘ خواہ وہ اِفراط کی راہ چل رہا ہو یا تفریط کی‘ اپنا ’بیانیہ‘ (narrative) ہی جاری کر دینے پر مُصر ہے! اِس ملک کو یہ سب مل کر کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ اِس سے پہلے بھی تو آخر ہم یہاں بستے چلے آئے ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے خوب کیا جو یہاں فقہاء کا ذکر ضروری جانا۔ اس سے فقہاء کا موقف سامنے آنے میں بھی مدد ملی اور فقہاء کے مواقف پر خود ان کا مطلع ہونا بھی۔ ورنہ نیریٹو (narrative) جاری کرنے کے لیے ”فقہاء“ کی کیا ضرورت تھی!

حواشی

(١) ادب الدنيا والدين‘ ص ١٣٦۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/YQKAEQ

(٢) الأحكام السلطانية ص‘٢٩۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/M3Tbt1

(٣) متفق عليه‘ واللفظ لمسلم http://goo.gl/sYrcmm

(٤) شرح مسلم‘ حديث رقم ١٤٤٢۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/nNJSrc

(٥) مراتب الإجماع‘ مؤلفه ابن حزم‘ ص ١٢٤۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/ljmDcY

(٦) نقد مراتب الإجماع‘ مؤلفه ابن تيميه‘ ص ٣٢٥۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/lROiOW

(٧) الأشباه والنظائر لابن نجيم‘ ج١‘ ص ٣٢٥۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/AdNKiy

(٨) غمز عيون البصائر‘ للحموي‘ ج٤‘ ص ١١١۔ حوالہ کاویب لنک http://goo.gl/FXUkZa

(٩) حاشية الدسوقي‘ ج٤‘ ص ١٣٤۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/gsy8MG

(١٠) أسنى المطالب في شرح روض الطالب‘ ج٤‘ ص ١١٠۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/9dn0n6

(١١) مطالب أولي النهى‘ ج٦‘ ص ٢٦٣۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/jqBi9S

(١٢) ...... مجموع فتاوى ابن تيمية‘ ج ٣٤‘ ص ١٧٥‘ ١٧٦۔ حوالہ کاویب لنک: http://goo.gl/ZZJEvW

Islam and the State: Another view

By Prof Muazzam Tahir Minhas

Wednesday, January 28, 2015
From Print Edition

33 4 10 0

The article about Islam and State published in The News has inherent contradictions. The individual cannot be separated from society. Hence the message given by Islam; in spite of its individualistic tentacles is collective and addressed to all the humanity of the world irrespective of colour, caste creed. It is not only addressed to humanity alone but at the same time addressed to Jinn as well (Vide Sura Al-Jinn).

Then Pakistan is a country which has come into existence only on the basis of Islam. The other country is Israel which has come into being on the concept of Zionism; by force of fraud and money. It has to be said that objective Resolution does not mean to Islamize the state. It gives a guideline to the already Islamic state of Pakistan. Thus state has a religion. Nobody can deny the ground reality in case of Pakistan. If Pakistan as a state does not have a religion, its raison d'etre falls into pieces.

The article does not exclude those persons from Islam who deviate from the path of Islam. Of course the Muslim women must observe purdah according to the tenets of the Quran and the Sunnah. Here I would the like to draw the attention of the readers to Sura Al-Ahzab… "Make not the dazzling display". Allah wishes to make you "pure and spotless". No doubt here the women have been enjoined not to exhibit their beauty in the public by wearing such dresses which invite the greedy eyes of men. In case of violation their exclusion from Islam is consistent in preserving the sanctity of the Quran and the Sunnah. No wonder we have been clearly directed to set the wrong right by any means within the orbit of Shariah inclusive of advice and persuation (Sura Al-Imran Ayat No 104, 110 coupled with Sura Al-Haj 41-Sura Luqman No 17).

The concept of parliamentary majority in the absence of the Quran and Sunnah negates the basic structure of the Islamic state.

Undeniably the consultative process is the quintessence of the Islamic state. It has been rightly said that the government cannot force the individual to perform Haj, Umra. In the article mixing of the government and the state has created in some minds a "confusion worst confounded" on subtle issues of Islamic matters and their nuanced connotation of Western orientation.

Modesty of women is one thing that has been sacrificed by the writer at the alter of unbridled liberalism. It is Taqwa that preserves the modesty of women and that is conspicuously missing in the said treatise. Taqwa has been the foundational stone of the caliphate. But denial of the very concept of Khilafat is a rendering of specific

Islamic vision tempered with western glamour and is in conflict with Sura Al-Noor directly supportive of the Quranic authority on Khilafat. How can concept of Khilafat been denied. The Al-Noor section 55 is detailed below- “Allah has promised, to those among you who believe and work righteous deeds, that He will of a surety give them in the land, inheritance (of power) as He granted it to those before them..”. Then the role models of Khilafat namely Hazrat Abu Bakr, Hazrat Usman, Omar bin Khittab, Hazrat Ali and Omar bin Abdul Aziz are the perpetual glittering Islamic light to guide the Ummah till eternity. Then man has been the vicegerent of God. The denial of our esteemed scholar the very concept of Khalifat reminds of the Pervazi school of thought who interpreted the word prayer in the light of doctrine of literalness. It must be realized that intellectual logicality extended beyond a certain limit acquires devilish tentacles and hence be discarded. No one should be swept by the liberal culture of the West and no one should see Islam through the spectacles of western society where Prophets are ridiculed and religiosity is desecrated in the manner of Chenghiz Khan and the like. The vision of the Khilafat needs to be corrected. The two things are distinctly missing from the article. One is piety and another is the foundational concept of Khilfat.

The concept of Islamic welfare state has not been touched in terms of political power orientation of the state. The sheer intellectual extension of the Islamic paraphernalia in a time-warp of logical rigmarole can serve Samuel Huntington inimical concept of ‘Civilizational Clash’ but would hardly serve the ends of ‘Islamic Polity’ in strategic political terms, so passionately needed in the tumultuous politics of the day. There are the crucial points the counter-narrative should have dealt at length. But it has not.

http://www.thenews.com.pk/Todays-News-2-298508-Islam-and-the-State-Another-view